ربیع الاوّل ۱۴۳۶ھ
جنوری ۲۰۱۵ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی : ڈاکٹر اسرار احمدؒ

حُرمتِ ظلم اور حقیقتِ توحید

”اربعین نوویؒ“ کی ایک حدیث کی تفہیم

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(نواں ایڈیشن) ———— صفحات:360، قیمت475روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(چھٹا ایڈیشن) ———— صفحات321، قیمت425روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
(پانچواں ایڈیشن) ———— صفحات331، قیمت425روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(چوتھا ایڈیشن) ———— صفحات394، قیمت475روپے

حصہ پنجم سُورۃُ مَریَم تا سُورۃُ السَّجدۃ
(تیسرا ایڈیشن) ———— صفحات480، قیمت575روپے

حصہ ششم سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات
(دوسرا ایڈیشن) ———— صفحات484، قیمت590روپے

ملنے کے پتے

انجمن خُدام القرآن خیبر پختونخوا پشاور
18-A، ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر2، شعبہ بازار پشاور، فون: (091)2584824,2214495

مکتبہ خُدام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 64

شمارہ : 1

ربیع الاوّل 1436ھ

جنوری 2015ء

فی شمارہ 30/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرون ملک 300 روپے
- بھارت وبنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

- **عرضِ احوال** — 5
  - نبی اکرم ﷺ کی شانِ رحمت — حافظ عاکف سعید
- **بیانُ القُرآن** — 11
  - سورۂ مریم (آیات ۱ تا ۵۰) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **مطالعۂ حدیث** — 32
  - حرمتِ ظلم اور حقیقتِ توحید — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **منتخب نصاب ۲** — 51
  - نظمِ جماعت کی پابندی
  - اور اس سے رخصت اور معذرت کا معاملہ — انجینئر حافظ نوید احمد
- **تعمیرِ سیرت** — 75
  - بخل اور اس کا انجام — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
- **دعوتِ فِکر** — 84
  - دینی تحریکوں کے مکاتبِ فکر
  - کے تنقیدی اسلوب کا جائزہ — خالد جامعی
- **بحث و نظر** — 89
  - ذوالقرنین' سدِ ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج (۵) — شاہین عطر جنجوعہ

❁ ❁ ❁

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

نبی اکرم ﷺ کی شانِ رحمت

ربیع الاوّل کے مہینہ کو نبی اکرم ﷺ سے خاص نسبت ہے۔ اِس کی ۱۲ تاریخ آپؐ کی تاریخِ وصال ہے اور ایک رائے کے مطابق یہی آپؐ کی تاریخ ولادت بھی ہے۔ چنانچہ اِسی نسبت سے اِس دن میلاد النبی ﷺ منایا جاتا ہے۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ سے ہر مسلمان عقیدت ومحبت اور جذباتی وابستگی رکھتا ہے۔ بنابریں ربیع الاوّل کے ان ابتدائی ایام میں سیرت کی محافل منعقد ہوتی ہیں‘ جن میں آپؐ کی بلند مرتبت اور عظیم الشان شخصیت کی عظمت کے پہلوؤں پر گفتگو ہوتی ہے‘ آپؐ کے مناقب کا تذکرہ ہوتا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی عظمت کا ادراک کریں تو یہ بات ہمارے لیے ناممکن ہے۔ ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بعد اِس کائنات میں سب سے زیادہ قابلِ احترام ہستی حضرت محمد ﷺ کی ہے۔ ع ’’بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر‘‘۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس کلام میں آپ ﷺ کی عظمت کے بعض پہلوؤں کا ذکر کیا ہے‘ اُن میں سے ایک آپؐ کی شانِ رحمت ہے جس کا تذکرہ سورۃ الانبیاء میں کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۷﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر‘‘۔ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی کس کس پہلو سے رحمت ہے‘ ہم کلیتہً اِس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ بہرحال یہ واضح ہے کہ آپ ﷺ کی ذات‘ آپؐ کا پیغامِ ہدایت اور آپؐ کا عطا کردہ دین اور نظامِ عدلِ اجتماعی پوری نوعِ انسانی کے لیے رحمت کا سامان ہے۔ آپ ﷺ کے ذریعے ہدایت کی جو روشنی پھیلی وہ انسانیت کے ہر ہر طبقے کے لیے مکمل رہنمائی ہے‘ خواہ وہ بڑے سے بڑا فلسفی‘ مفکر یا دانشور ہو یا ایک عام انسان‘ محنت کش یا مزدور۔

سورۃ الاعراف کی آیات ۱۵۶‘۱۵۷ میں پوری نوعِ انسانی کے لیے بلکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے آپ ﷺ کی رحمت کے بعض اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے بنی اسرائیل کے استغفار کا ذکر ہے۔ جس کا پس منظر یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام تورات کی الواح اور شریعت پانے کی غرض سے کوہِ طور پر گئے تو آپؑ کے پیچھے قوم نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ یہ بہت بڑا جرم تھا۔ چنانچہ اِس جرم پر قوم کو سخت سزا دی گئی۔ سزا یہ تھی کہ جن لوگوں نے اِس جرم کا ارتکاب کیا تھا‘ انہی کے عزیزوں اور رشتہ داروں نے انہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ اس سزا کے بعد اجتماعی استغفار کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کے ستر افراد کو لے کر کوہِ طور پر تشریف لے گئے۔ وہاں اللہ سے استغفار ہوا‘ اللہ تعالیٰ کا جواب بایں الفاظ نقل ہوا ہے: ﴿قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ﴾ ’’فرمایا کہ جو میرا عذاب ہے اُسے تو میں جس (مجرم) پر چاہتا ہوں نازل کرتا ہوں‘ اور جو میری رحمت ہے وہ ہر چیز کو شامل ہے‘‘۔ مطلب یہ ہے اللہ کی رحمت اپنی جگہ مگر جنہوں نے خود ہی اپنے آپ کو عذاب الٰہی کا مستحق بنایا‘ وہ اس کے عذاب سے بچ نہیں سکیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ میرا دامن رحمت بڑا وسیع ہے۔ آؤ‘ میری طرف توجہ کرو۔ آؤ‘ مجھ سے گناہوں کی مغفرت مانگو۔ آؤ‘ میرا دامن رحمت تھام لو۔ اب اگر کوئی خود ہی اُس سے رجوع نہ کرے‘ جو عملاً طے کر دے کہ میں نے اس کی رحمت سے محروم رہنا ہے تو ظاہر ہے ایسے ظالم کے لیے اللہ کا عذاب پھیرا نہیں جائے گا۔ یہ اسی قسم کی بات ہے جو آپ ﷺ نے ایک موقع پر فرمائی کہ: ’’ہر بندۂ مومن جنت میں داخل ہوگا ماسوائے اس کے کہ جو خود ہی انکار کر دے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! کون ہوگا جو جنت میں جانے سے انکار کرے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے گویا خود ہی جنت میں جانے سے انکار کر دیا‘‘۔

اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا: ﴿فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۵۶﴾ ’’میں لکھ لوں گا اِس رحمت کو اُن لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہوں گے‘‘۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت عام ہے اور ایک خاص۔ یہاں رحمتِ خاص کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو تقویٰ اختیار کریں گے‘ زکوٰۃ دیں گے‘ یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھیں گے اور اللہ کی تمام آیات پر ایمان لائیں گے۔ اور اس رحمت کے اصل مستحق وہ لوگ ہوں گے جن کا ذکر اگلی آیت میں آیا ہے‘ جہاں فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ

الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ﴾ ''وہ لوگ جو میرے رسول نبی اُمّی کا اتباع کریں گے' جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں''۔ نبی اکرم ﷺ کی رحمۃ للعالمینی ویسے تو عام ہے لیکن رحمت خاص اُن لوگوں کے لیے ہے جو آپؐ پر ایمان لانے والے ہیں اور آپؐ کی اتباع کرنے والے ہیں۔ یعنی اگر کوئی پہلے سے یہودی یا عیسائی تھا مگر اس دور میں پیدا ہوا جو نبی ﷺ کی رسالت کا دور تھا تو وہ آنحضرتؐ پر ایمان لائے گا اور آپؐ کا اتباع کرے گا تو ہی اللہ کی رحمت کا مستحق ٹھہرے گا۔

آگے نبی اکرم ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کے جو مختلف پہلو ہیں اُن میں سے بعض کا تذکرہ ہے۔ آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا پہلا مظہر یہ ہے کہ: ﴿یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ''جو (نبیؐ) ان کو معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں''۔ سوال یہ ہے کہ ہر نبی اور رسول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہا' خیر کی تلقین کرتا رہا اور شر سے روکتا رہا' پھر یہاں خصوصیت سے اس کے تذکرہ کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ معروف و منکر اور خیر و شر جو بہت پرانی بحث ہے اس میں آخری اور کامل فیصلہ آپ ﷺ کا ہے۔ آپؐ کی سنت' آپؐ کے فرامین خیر و شر اور معروف اور منکر کے لیے معیار ہیں۔ جس بات کا آپ ﷺ نے حکم دیا وہی معروف ہے اور جس سے روک دیا وہ منکر ہے۔ گویا آپؐ نے اللہ کے اذن سے معروف و منکر اور خیر و شر کی بحث کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ چونکہ آپؐ نے معروف و منکر اور خیر و شر کا فیصلہ فرما دیا' اس لیے قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے کہ: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ (الحشر:۷) ''رسول ﷺ جو کچھ تمہیں دیں اس کو تھام لو اور جس سے روک دیں اُس سے باز آ جاؤ''۔

اب ہر دور میں اگر کسی کو یہ دیکھنا ہے کہ کیا شے معروف ہے اور کیا منکر تو اس کا معیار آپ ﷺ کی سنت' آپؐ کا اسوۂ کامل ہے۔ آج دجالی تہذیب کے علمبرداروں کی کوشش ہے کہ اس معیار کو بدل ڈالیں' اس کو تلپٹ کر دیں۔ انہی کی سازشوں کا نتیجہ ہے کہ آج منکرات کو معروفات کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ مثلاً آپ ﷺ نے تعلیم دی کہ حیا ایمان کا حصہ ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کی رو سے بے حیائی اور عریانی شیطنت ہے' کیونکہ یہ شیطان ہی ہے جو انسان کو حیا سے محروم کر کے حیوانیت کے راستے پر لانا چاہتا ہے۔ اُس کی کوشش ہے کہ اُسے شرفِ انسانیت سے محروم رکھے۔ لیکن آج معاشرہ میں جس چیز کو معروف سمجھا جاتا ہے'

وہ بے حیائی ہے۔ آج شیطان اور اُس کے پیروکار انسان کو بالکل ہی لباسِ حیا سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ ماں' بہن' بیٹی اور بیوی کے فرق کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عالمِ مغرب میں خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ ناجائز تعلقات کی گرم بازاری ہے۔ معاشرہ کی اکثریت ان بچوں کی ہے جن کی ولدیت کی کسی کو خبر نہیں۔ یہ بچے ایسی فضا میں پرورش پا رہے ہیں کہ والدین کی شفقت سے محروم ہیں..... اِس کے علاوہ جدید تہذیب میں خود غرضی اور مفاد پرستی کو معروف کا درجہ دے دیا گیا ہے اور ایثار و قربانی وغیرہ ثانوی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ نظریۂ افادیت (Utilitarianism) اعلیٰ اخلاقی اقتدار کو تلپٹ کر رہا ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ اصل بھلائی اور خیر وہ کام ہے جس سے انسان کو ذاتی نفع حاصل ہو' یا کوئی لذت حاصل ہو۔ اگر کسی کام سے ذاتی منفعت حاصل نہیں ہوتی تو اس کی کوئی حیثیت نہیں' یہ تو وقت کا ضیاع ہے۔ کفار کے ساتھ ساتھ منافقین بھی آج اسی شیطانی تہذیب کو فروغ دے رہے ہیں' کیونکہ قرآن حکیم کے مطابق یہی منافقین کا کام ہے۔ اندریں حالات سسکتی ہوئی انسانیت کی بھلائی اِسی میں ہے کہ وہ معروف اور منکر کے اُس معیار کو اختیار کر لے جو نبی اکرم ﷺ نے عطا فرمایا ہے۔ اسی صورت میں وہ آپؐ کی رحمۃ للعالمینی سے اکتسابِ فیض کر سکے گی' ورنہ اس معیار کو ترک کر کے انسان خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارے گا۔ انسانیت کا خون کرے گا۔ انسانیت کی دھجیاں بکھیرے گا۔

آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا مظہر یہ بھی ہے کہ آپؐ نے حلال اور حرام کو کھول کر بیان فرمایا۔ فرمایا: ﴿وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ﴾ ''اور (آپؐ) ہر طیب (پاک صاف) چیز کو اُن کے لیے حلال کرتے ہیں اور ہر خبیث (نجس و ناپاک) شے کو اُن پر حرام ٹھہراتے ہیں''۔ یہودیوں کی شرارتوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بعض حلال چیزیں بھی ان پر حرام قرار دی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ اب آپؐ کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر پاکیزہ شے کو جائز اور حلال قرار دیں اور ہر ایسی شے جس میں نجاست اور خباثت ہے' انسانیت کو اُس کی مضرت سے بچانے کے لیے اُس سے روک دیں یعنی اُس چیز کو حرام کر دیں۔ حلت و حرمت کا یہ مستقل فیصلہ نبی رحمت ﷺ نے کر دیا۔ اب ہر وہ چیز حرام ہے جو نبی ﷺ نے حرام قرار دی اور ہر وہ چیز جس پر آپؐ نے حرمت کا حکم نہیں لگایا' حلال ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی رحمت کا مظہر یہ بھی ہے کہ آپؐ نے انسانیت کو ناروا بوجھوں اور غلامی

کے طوقوں سے نجات دلائی۔ فرمایا:﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ ''اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان (کے سر) پر (اور گلے میں) تھے اتارتے ہیں''۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ جسے مفسرین نے بیان کیا ہے کہ پچھلی امتوں کی شریعتوں میں بعض احکامات بڑے سخت تھے۔ ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے ذریعے اس امت کے لیے بہت آسانیاں پیدا فرمائیں۔ مثال کے طور پر روزہ ہی کو دیکھیں۔ ہمارا روزہ صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور غروبِ آفتاب پر ختم ہوتا ہے۔ یہود کے ہاں سحری کا تصور نہیں تھا' بلکہ اُن کا روزہ رات سے ہی' جب وہ سو جاتے تھے شروع ہو جاتا تھا۔ وہ اصل بوجھ اور طوق جن سے آپؐ نے انسانیت کو نجات دلائی اِس کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں۔ وہ کیا ہیں۔ سب سے بڑا طوق جس سے آپؐ نے نوعِ انسانی کو چھٹکارا دلایا' وہ غلامی کا تھا۔ آپؐ سے پہلے ملوکیت اور شہنشاہیت کا دور دورہ تھا۔ دنیا میں جابرانہ ملوکیت (Monarchy) کا نظام رائج تھا۔ اس نظام میں تمام ریاستی اختیارات ایک ہی خاندان کے پاس تھے۔ وہی سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ اُسے تمام حقوق حاصل تھے۔ قانون سازی پر بھی اُسی کا حق تھا' وہ جو چاہتا قانون بناتا۔ رعایا کے کوئی حقوق نہ تھے۔ اُن کا کام حکمرانوں کی خدمت کرنا' بادشاہ کے بنائے ہوئے قوانین کی پاسداری کرنا اور محصول ادا کرنا تھا۔ اس طرح پوری قوم بادشاہ کی غلام ہوتی تھی۔ انسانی حقوق اور مساوات کے تصورات یکسر ناپید تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے آ کر انسانیت کو غلامی کے بندھن اور ظالمانہ شہنشاہیت سے نجات دلائی اور انسانی حقوق کا تصور عطا فرمایا۔ سیاسی سطح پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر مبنی وہ نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کر کے دکھایا جس میں مساوات پائی جاتی ہے۔ قانون کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔ اس معاملے میں خلیفہ اور رعایا میں بھی کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ اس طرح یہ نظام انسانیت کو بادشاہوں کی غلامی سے نجات دیتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سفیر ربعی عامر نے ایرانی سپہ سالار سے کہی تھی کہ: ''ہم ایک ایسی قوم ہیں جسے اللہ نے اس مقصد کے لیے مبعوث کیا ہے کہ ہم اُس کی مخلوق کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی غلامی میں دے دیں..... اور باطل ادیان اور طاغوتی قوتوں کے ظلم وجور سے بچا کر اسلام کے سایۂ رحمت میں لے آئیں۔''

ظالمانہ ملوکیت کے ساتھ ساتھ استحصال کی ایک اور صورت مذہبی طبقات کی اجارہ داری تھی۔ ہر دور میں مذہبی طبقے اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان واسطہ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کہا

جاتا ہے کہ ہماری مٹھی گرم کرو' ہمیں خوش کرو' نذرانے دو' ہم تمہاری بات آگے پہنچائیں گے' کیونکہ تم ناپاک اور گناہگار ہو' براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہم کلام نہیں ہو سکتے۔ یہ مذہبی غلامی کا طوق تھا جو انسانوں کی گردنوں میں پڑا تھا۔ آپ ﷺ نے انسان کو اس طوق سے بھی نجات دلائی اور انسانیت پر واضح کر دیا کہ خالق ومخلوق کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے براہ راست دعا کی جائے' وہ ہر ایک کی دعا کو سنتا اور اس کا جواب دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں فرمایا: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ.....﴾ (البقرۃ:۱۸۶) ''(اے نبی ﷺ) میرے بندے جب آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ بتا دیجئے) میں بالکل قریب ہوں' میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے' پس انہیں چاہیے کہ مجھے ہی پکاریں.....'' اسی بات کو اقبال نے شعری جامہ پہنایا تو گویا ہوئے ؎

کیوں خالق ومخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپؐ نے بنی نوع انسان کو ناروا بوجھوں سے نجات دلائی۔ یہ ناروا معاشرتی رسومات کے بوجھ تھے' جن کے نیچے انسانیت کراہ رہی تھی۔ مثلاً پیدائش' وفات اور شادی بیاہ کی رسومات وغیرہ۔ ان رسومات کی ابتدا بالعموم امیر طبقات سے ہوتی ہے' مگر جب ایک دفعہ یہ شروع ہو جاتی ہیں تو پھر سب لوگ انہیں اختیار کر لیتے ہیں' اِن کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر یہ "Social Compulsion" بن جاتی ہیں۔ چنانچہ معاشرہ کی عظیم اکثریت ان کے بوجھ تلے پس کر رہ جاتی ہے' لیکن خواہی نخواہی انہیں انجام دینا پڑتا ہے۔ افسوس کہ آج ہمارا معاشرہ انہی رسومات میں جکڑا ہوا ہے۔

آج بحر وبر میں فساد برپا ہے۔ نوعِ انسانی جبر واستبداد' ظلم وناانصافی' معاشرتی عدم مساوات' معاشی ناہمواری اور سیاسی لحاظ سے آقائی ومحکومی کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے۔ فرزندانِ توحید جو نبی آخر الزماں ﷺ کی امت اجابت ہیں' تو اور بھی زبوں حال ہیں' اور بے بسی ولاچارگی اور مظلومی ومحکومی کے تصویر بنے ہوئے ہیں۔ فکری ونظریاتی اور سیاسی وعسکری محاذوں پر اغیار کی ضرب کاری سے جسد ملی پر گہرے گھاؤ آ چکے ہیں' اور تن ہمہ داغ داغ شد کی کیفیت ہے۔ (باقی صفحہ 74 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ مَریَم

تمہیدی کلمات

سورۂ مریم ''مکی مدنی'' سورتوں کے تیسرے گروپ میں شامل ہے۔اس گروپ کی مکیات کا آغاز سورۂ یونس سے ہوا تھا۔ان میں سے جن نو سورتوں کا ہم اب تک مطالعہ کر چکے ہیں وہ تین تین کے تین ذیلی گروپس میں منقسم ہیں۔ ہر ذیلی گروپ کے اندر دو دو سورتیں جوڑے کی شکل میں ہیں' جبکہ تیسری سورت منفرد مزاج کی حامل ہے۔مثلاً پہلے ذیلی گروپ میں سورۂ یونس اور سورۂ ہود جوڑے کی حیثیت سے ہیں' جبکہ سورۂ یوسف (ایک ہی نبی یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات پر مشتمل) منفرد ہے۔دوسرے ذیلی گروپ میں سورۃ الرعد اور سورۂ ابراہیم جوڑے کی شکل میں ہیں' جبکہ سورۃ الحجر منفرد ہے' بلکہ سورۃ الحجر تو اس پورے گروپ میں ہی منفرد مزاج کی سورت ہے۔اس کا انداز بالکل ابتدائی زمانے کی سورتوں جیسا ہے' یعنی چھوٹی چھوٹی آیات' تیز ردھم اور ملکوتی غنائیت بہت نمایاں۔تیسرے ذیلی گروپ میں سورۃ النحل منفرد مزاج رکھتی ہے' جبکہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف ایک حسین وجمیل جوڑے کی شکل میں ہیں۔

اب سورۂ مریم سے ''مکی مدنی'' سورتوں کے اس بڑے گروپ کے چوتھے ذیلی گروپ کا آغاز ہو رہا ہے' جس میں سورۂ مریم' سورۂ طٰہٰ اور سورۃ الانبیاء شامل ہیں۔پچھلے ذیلی گروپس کی طرح یہاں بھی دو سورتوں (سورۂ مریم اور سورۃ الانبیاء) کی آپس میں گہری مشابہت ہے' جبکہ ایک سورت (طٰہٰ) منفرد ہے۔سورۂ مریم اور سورۃ الانبیاء دونوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ قصص النبیین کے انداز میں ہے۔ان تذکروں میں ''انباء الرسل'' یا ''ایام اللہ'' جیسا وہ انداز نہیں جو ہم سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں ملاحظہ کر چکے ہیں کہ رسول آئے' انہوں نے دعوت

دی' قوم نے انکار کیا اور وہ قوم ہلاک کر دی گئی۔

اس ذیلی گروپ کی منفرد سورت یعنی سورۂ طٰہٰ میں سورۂ یوسف کی طرح صرف ایک ہی رسول کا تذکرہ ہے۔اس کے آٹھ میں سے پانچ رکوع مسلسل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات پر مشتمل ہیں۔اس لحاظ سے سورۂ طٰہٰ سورۂ یوسف کے ساتھ معنوی نسبت بھی رکھتی ہے۔یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر میں آ کر آباد ہوئے (اس کا ذکر سورۂ یوسف میں ہے)' جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں انہیں فرعون کی غلامی سے نجات ملی (اس کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں ہے) اور وہ اپنے آبائی وطن فلسطین کی طرف روانہ ہوئے۔

سورۂ مریم ہجرتِ حبشہ سے قبل نازل ہوئی۔اس کے دوسرے رکوع میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا تعارف بیان فرمایا گیا ہے۔یہ آیات مسلمان مہاجرین کو سفرِ حبشہ کے زادِ راہ کے طور پر عطا ہوئی تھیں۔عنقریب انہیں شاہِ حبشہ (نجاشی) کے دربار میں پیش آنے والی مشکل صورتِ حال میں ان آیات کی مدد درکار تھی۔حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو واپس لانے کے لیے قریشِ مکّہ نے عمرو بن العاص (جو بعد میں ایمان لا کر جلیل القدر صحابی بنے رضی اللہ عنہ) کی سرکردگی میں نجاشی کے دربار میں ایک سفارت بھیجی۔ان لوگوں کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں بلا کر ان سے حقیقت حال دریافت کی۔مسلمانوں نے جواب میں وہ تمام حالات بتائے جن کی وجہ سے وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر حبشہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔نجاشی نے مسلمانوں کا موقف سننے کے بعد انہیں قریش کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں اجازت دے دی کہ وہ اس کے ملک میں جہاں چاہیں رہ سکتے ہیں۔اس کے بعد عمرو بن العاص نے ایک اور داؤ کھیلا اور نجاشی کے دربار میں دوبارہ حاضر ہو کر کہا کہ آپ ان لوگوں کو بلا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کا عقیدہ دریافت کریں۔یہ لوگ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک عام انسان سمجھتے ہیں۔اس پر نجاشی نے مسلمانوں کو ایک بار پھر اپنے دربار میں طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے۔اس پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ بن ابی طالب (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق سورۂ مریم کی آیات پڑھ کر سنائیں۔کلامِ الٰہی سن کر نجاشی بہت متاثر ہوا۔اُس نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ جو کچھ تم نے بیان کیا ہے حقیقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس تنکے کے برابر بھی اس سے زائد نہیں ہیں۔اس کے بعد اُس نے قریش کی سفارت کو یہ کہہ کر واپس

بھیج دیا کہ میں ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہیں کرسکتا' چاہے تم لوگ مجھے پہاڑوں کے برابر سونا بھی دے دو۔

آیات ۱ تا ۱۵

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾ ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ قَالَ
رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ
شَقِيًّا ﴿۴﴾ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ
لَّدُنْكَ وَلِيًّا ﴿۵﴾ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۗ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿۶﴾ يٰزَكَرِيَّآ
اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿۷﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى
يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿۸﴾ قَالَ
كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴿۹﴾
قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿۱۰﴾
فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾ يٰيَحْيٰى
خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ
تَقِيًّا ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ
يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾

آیت ۱ ﴿كٓهٰيٰعٓصٓ ۝۱﴾ ''ک' ہ' ی' ع' ص۔''

قرآن مجید کی یہ واحد سورت ہے جس کے آغاز میں اکٹھے پانچ حروفِ مقطعات ہیں۔ اگرچہ سورۃ الشوریٰ کے شروع میں بھی پانچ حروفِ مقطعات ہیں' لیکن وہاں یہ دو آیات میں ہیں۔ دو حروف ﴿حٰمٓ ۝۱﴾ پہلی آیت میں' جبکہ تین حروف ﴿عٓسٓقٓ﴾ دوسری آیت میں ہیں۔ بہرحال سورۂ مریم کو اس لحاظ سے انفرادیت حاصل ہے کہ اس کے آغاز میں اکٹھے پانچ حروفِ مقطعات آئے ہیں۔

آیت ۲ ﴿ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝۲﴾ ''یہ ذکر ہے آپؐ کے رب کی رحمت

کا جو اُس نے اپنے بندے زکریاؑ پر کی۔''

یہاں ذکر تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کرنا مقصود ہے مگر آپؑ کے ذکر سے پہلے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر کیا جا رہا ہے' کیونکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت بھی تو ایک بہت بڑا معجزہ تھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور آپؑ کی اہلیہ بھی نہ صرف بوڑھی تھیں بلکہ عمر بھر بانجھ بھی رہی تھیں۔ ان حالات میں ان کے ہاں بیٹے کی پیدائش کوئی معمول کا واقعہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کو یہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔

آیت ۳ ﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝۳﴾ ''جب اُس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے۔''

یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے دل ہی دل میں اپنے رب سے دعا کی۔

آیت ۴ ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ﴾ ''اُس نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! بلاشبہ میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں''

﴿وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا﴾ ''اور میرا سر بھڑک اُٹھا ہے بڑھاپے سے''

یعنی بڑھاپے کے سبب میرے سر کے بال مکمل طور پر سفید ہو گئے ہیں۔

﴿وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝۴﴾ ''اور اے میرے پروردگار! میں تجھے پکار کر کبھی بھی نامراد نہیں رہا۔''

چنانچہ آج میں بڑی ہمت کر کے تجھ سے ایک بہت ہی غیر معمولی دعا کرنے جا رہا ہوں۔ دُنیوی حالات اور طبیعی قوانین کے اعتبار سے تو ایسا ہونا ممکن نہیں' مگر تو چاہے تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

آیت ۵ ﴿وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ﴾ ''اور مجھے اندیشہ ہے اپنے بھائی بندوں سے اپنے بعد''

مجھے اپنے ورثاء میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو میرے بعد ہیکلِ سلیمانی کا متولی اور میرا جانشین بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

﴿وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝۵﴾ ''اور میری بیوی بانجھ ہے' تو تُو مجھے خاص اپنے پاس سے ایک ولی عطا کر۔''

یہاں ''ولی'' لفظ بہت اہم ہے' یعنی مجھے ایسا ساتھی عطا کر جو میرے مشن میں میرا دوست و بازو بن سکے۔

آیت ۶ ﴿یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۫﴾ ''جو وارث ہو میرا اور آلِ یعقوب کا''

مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو میری دینی و روحانی وراثت کو سنبھال سکے' اور میری وراثت کیا! یہ تو آلِ یعقوبؑ کی وراثت ہے۔ اس مقدس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے مجھے ایک ایسا وارث عطا کر جو واقعی اس منصب کا اہل ہو۔

﴿وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ۝۶﴾ ''اور اے میرے پروردگار! اس کو بنائیو پسندیدہ۔''

رَضِیّ فعیل کے وزن پر ہے' چنانچہ اس میں راضی (وہ جو راضی ہو) اور مرضِیّ (جس کو راضی کر دیا گیا ہو) دونوں کیفیتوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ البینہ (آیت ۸) میں فرمایا گیا: ﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ﴾ کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔ اسی طرح سورۃ الفجر میں نفسِ مطمئنہ کے حوالے سے فرمایا گیا: ﴿ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝۲۸﴾ ''تو لوٹ جا اپنے پروردگار کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے راضی' وہ تجھ سے راضی'' —— اس دعا کے جواب میں حضرت زکریا علیہ السلام کو بشارت دی گئی:

آیت ۷ ﴿یٰزَكَرِیَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ یَحْیٰی ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ۝۷﴾ ''اے زکریاؑ! ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں ایک لڑکے کی جس کا نام یحییٰ ہوگا' ہم نے اس سے پہلے اس کا کوئی ہم نام نہیں بنایا۔''

اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے اس سے پہلے اس کا کوئی نظیر نہیں بنایا' یعنی اس جیسی صفات کسی میں پیدا نہیں کیں۔

آیت ۸ ﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ﴾ ''اُس نے کہا: اے میرے پروردگار! میرے ہاں بیٹا کیسے ہو جائے گا''

یہ وہی بات ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام کے حوالے سے ہم سورۂ آل عمران (آیت ۴۰) میں بھی پڑھ چکے ہیں۔

﴿وَّكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِیًّا ۝۸﴾ ''جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں پہنچ چکا ہوں بڑھاپے کے باعث سوکھ جانے کی حالت کو!''

یعنی بڑھاپے کی وجہ سے میرے جسم میں حیات کے سارے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔

آیت ۹ ﴿قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ﴾ ''فرمایا: ایسے ہی ہوگا! تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ یہ مجھ پر آسان ہے''

﴿وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَیْـًٔا ۝۹﴾ ''اور تمہیں بھی تو میں نے پیدا کیا اس سے پہلے جبکہ تم کچھ بھی نہیں تھے۔''

آیت ۱۰ ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً ؕ﴾ ''عرض کیا: اے میرے پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما دے۔''

﴿قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۝۱۰﴾ ''فرمایا: تمہارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم گفتگو نہیں کر سکو گے لوگوں سے تین راتیں متواتر۔''

گویا بطور نشانی اللہ تعالیٰ نے تین دنوں تک حضرت زکریا علیہ السلام کی قوتِ گویائی سلب کر لی۔ سورۂ آلِ عمران (آیت ۴۱) میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ﴾ یعنی آپؑ تین دن تک لوگوں سے گفتگو نہیں کر سکو گے مگر اشاروں کنایوں میں۔

آیت ۱۱ ﴿فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ﴾ ''پھر وہ حجرے سے نکل کر اپنی قوم کی طرف آیا''

اپنی عبادت' راز و نیاز اور مناجات کے بعد حضرت زکریا علیہ السلام اپنے حجرے سے نکل کر اپنی قوم کے لوگوں کی طرف آئے۔

﴿فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا ۝۱۱﴾ ''اور انہیں اشارے سے کہا کہ تم لوگ تسبیح بیان کرو صبح و شام۔''

آپؑ نے لوگوں کو اشاروں کنایوں سے سمجھایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت اہم فیصلہ ہونے جا رہا ہے' لہٰذا تم لوگ صبح و شام کثرت سے اللہ کی تسبیح و تحمید کرتے رہو۔ عربی میں ''وحی'' کے لغوی معنی ہیں: **الاعلام بالسِّر والخِفاء**' یعنی کسی کو اشارے سے کوئی بات اس طرح بتانا کہ دوسروں کو پتا نہ چلے۔ انبیاء و رسل علیہم السلام کی طرف جو وحی آتی ہے اس کی کیفیت بھی یہی ہوتی ہے۔ وحی کی مختلف صورتوں کا تذکرہ (بیان القرآن' جلد اول کے آغاز

میں) ''تعارفِ قرآن'' کے ضمن میں آچکا ہے۔ آگے سورۃ الشوریٰ میں بھی اس کا ذکر آئے گا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد اب ان کو براہِ راست مخاطب کیا جا رہا ہے:

آیت ۱۲ ﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ﴾ ''اے یحییٰ کتاب کو مضبوطی سے تھام لو!''

کتاب سے مراد یہاں زبور' تورات اور دیگر صحائف ہیں جو اُس وقت بنی اسرائیل کے درمیان موجود تھے۔

﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿١٢﴾﴾ ''اور ہم نے اُس کو عطا کر دی حکمت و دانائی بچپن ہی میں۔''

اب حضرت یحییٰ علیہ السلام کے خصوصی اوصاف بیان کیے جا رہے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام (John the Baptist and Jesus of Nazarat) دونوں ایسی غیر معمولی شخصیات ہیں کہ ان جیسے اوصاف دوسرے انبیاء و رسل علیہم السلام میں بھی نہیں پائے گئے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن ہی میں حکمت عطا کر دی گئی۔

آیت ۱۳ ﴿وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿١٣﴾﴾ ''اور ہماری طرف سے سوز و گداز والی محبت اور پاکیزگی (اُسے عطا ہوئی) اور وہ بہت متقی تھا۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾﴾ ''اور وہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا تھا' اور خودسر و نافرمان نہیں تھا۔''

یہ اوصاف اللہ تعالیٰ کی خصوصی عطا کے طور پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی گھٹی میں ڈال دیے گئے۔

آیت ۱۵ ﴿وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾﴾ ''اور سلام اُس پر جس دن اُس کی ولادت ہوئی' جس دن اُسے موت آئے اور جس دن وہ اٹھایا جائے زندہ کر کے۔''

یہاں پر حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کا قصہ اختتام کو پہنچا اور اب آگے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے۔

آیات ۱۶ تا ۴۰

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ

مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۣ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ
اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ
لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾
قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ
وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَاَجَآءَهَا
الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا
مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّيْٓ
اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ
فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ
اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا
فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾
فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ
اللّٰهِ ۣ ۭ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿٣٠﴾ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠
وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿٣١﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ
جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿٣٢﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾
ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ
يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٣٥﴾ وَاِنَّ
اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٣٦﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ
مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿٣٧﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ
وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ
الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٩﴾ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ
الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿٤٠﴾

آیت ۱۶ ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ﴿۱۶﴾﴾ ''اور (اب) ذکر کیجیے اس کتاب (قرآن) میں مریم کا' جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر ایک شرقی گوشے میں جا بیٹھی۔''

حضرت مریم (سلامٌ علیہا) نے اپنے لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر ہیکل سلیمانی کے مشرقی گوشے میں خود کو مقیّد کر لیا۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کے لیے اعتکاف کی کیفیت تھی۔

آیت ۱۷ ﴿فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ﴾ ''تو اُس نے اپنے آپ کو ان سے پردے میں کر لیا۔''

انہوں نے گوشے میں پردہ تان کر خلوت کا ماحول بنا لیا تا کہ یکسوئی سے اللہ کی عبادت کر سکیں۔

﴿فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا﴾ ''پس ہم نے بھیجا اُس کی طرف اپنا ایک فرشتہ''

یہاں پر روح بمعنی فرشتہ ہے۔ قبل ازیں تفصیلاً بیان ہو چکا ہے کہ فرشتہ بھی روح ہے' وحی بھی روح ہے' قرآن بھی روح ہے اور روحِ انسانی بھی روح ہے۔

﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾﴾ ''تو اُس نے صورت اختیار کی اُس (مریم) کے سامنے ایک مکمل انسان کی۔''

یعنی فرشتہ ان کے سامنے ایک مکمل انسان کی صورت میں نمودار ہوا۔

آیت ۱۸ ﴿قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾﴾ ''مریم نے کہا: میں رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں تم سے اگر تم کوئی متقی شخص ہو۔''

اچانک ایک مرد کو اپنی خلوت گاہ میں دیکھ کر حضرت مریم (سلامٌ علیہا) گھبرا گئیں کہ وہ کسی بری نیت سے نہ آیا ہو۔ چنانچہ انہوں نے اسے مخاطب کر کے کہا کہ میں تم سے اللہ کی پناہ چاہتی ہوں' اور اگر تم اللہ سے ڈرنے والے ہو' تمہارے دل میں اللہ کا کچھ بھی خوف ہے تو کسی برے ارادے سے باز رہنا۔

آیت ۱۹ ﴿قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾﴾ ''اُس نے کہا: میں تو آپ کے رب کا فرستادہ ہوں تا کہ میں آپ کو ایک پاکیزہ بیٹا عطا کروں۔''

آیت ۲۰ ﴿قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾﴾

''مریم نے کہا: میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا؟ جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور نہ ہی میں کوئی بدچلن عورت ہوں۔''

آیت ۲۱ ﴿قَالَ كَذٰلِكِ ۚ﴾ ''اُس (فرشتے) نے کہا: ایسے ہی ہوگا!''

یعنی کسی مرد کے تعلق کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ آپ کو بیٹا عطا فرمائے گا۔

﴿قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾﴾ ''آپ کا رب فرماتا ہے کہ یہ مجھ پر آسان ہے' تا کہ ہم اسے بنائیں ایک نشانی لوگوں کے لیے اور رحمت اپنی طرف سے' اور یہ ایک طے شدہ امر ہے۔''

یعنی اس بچے کو ہم لوگوں کے لیے معجزہ اور اپنی رحمت کا ذریعہ بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی معجزہ تھی' آپؑ کا رفع سماوی بھی معجزہ تھا اور اس کے علاوہ بھی آپؑ کو بہت سے معجزات عطا ہوئے تھے۔ غرض آپؑ کی شخصیت ہر لحاظ سے غیر معمولی' ممیّز اور ممتاز تھی۔

آیت ۲۲ ﴿فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾﴾ ''تو اُسے اس (بچے) کا حمل ٹھہر گیا' چنانچہ وہ اسے لے کر ایک دور جگہ پر چلی گئی۔''

اس پریشانی میں کہ حمل بڑھے گا تو لوگ کیا کہیں گے' حضرت مریم تنہائی کی غرض سے بیت اللحم چلی گئیں' جو ہیکلِ سلیمانی سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔''

آیت ۲۳ ﴿فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ﴾ ''پھر لے آیا اسے دردِ زہ ایک کھجور کے تنے کے پاس۔''

ولادت کے وقت جب دردِ زہ کی شدت بڑھی تو حضرت مریم نے سہارے کے لیے ایک کھجور کے تنے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ یہ درد کی شدت کو برداشت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اگر عورت وضع حمل کے وقت کسی چیز کو مضبوطی سے تھام لے تو اس میں درد کو برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔

﴿قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾﴾ ''(اس کیفیت میں) اُس نے کہا: کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور ایک بھولی بسری چیز ہو چکی ہوتی۔''

اللہ کی وہ بندی ممکنہ اندیشوں سے کانپ رہی تھی کہ اب میں اس بچے کا کیا کروں گی؟ لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ دنیا کیا کہے گی؟ کاش یہ وقت آنے سے پہلے ہی مجھے موت آ گئی ہوتی اور میری یاد تک لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو چکی ہوتی۔

آیت ۲۴ ﴿فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ﴾ ''تو اُس نے پکارا اسے اس کے نیچے سے''

یہاں عام مفسرین کا خیال یہ ہے کہ جس فرشتے نے پہلے بشارت دی تھی اسی نے اب بھی انہیں آواز دی۔ مِنْ تَحْتِهَآ کا مفہوم یہی لیا گیا ہے کہ اس وقت حضرت مریم نسبتاً بلند جگہ پر ہوں گی اور وہ فرشتہ ذرا نشیب میں ہوگا۔ ویسے بھی وضع حمل کے موقع پر فرشتے کا آپ کے بالکل قریب رہنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن مِنْ تَحْتِهَا کی ایک قراءت مَنْ تَحْتَهَآ بھی ہے' یعنی اسے پکارا اُس نے جو اس کے نیچے تھا۔ اس ترجمے کے مطابق مفہوم یہ ہوگا کہ ولادت کے فوراً بعد بچہ بول پڑا اور میں یہاں اسی مفہوم کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس لیے کہ اگر اس وقت بچے نے کلام نہ کیا ہوتا تو حضرت مریم کو کیسے یقین آتا کہ یہ بچہ لوگوں کے سوالات کا خود ہی جواب دے گا اور وہ بچے کو لے کر لوگوں کے سامنے آنے پر کیونکر تیار ہو جاتیں۔ بہرحال وہ جو نیچے تھا اس نے آپ کو پکار کر کہا:

﴿اَلَّا تَحْزَنِيْ﴾ ''کہ آپ غمگین نہ ہوں''

اگر یہ حضرت مسیح علیہ السلام یعنی نومولود ہی کا کلام ہے تو گویا آپؑ اپنی والدہ کو تسلی دے رہے ہیں کہ امّی جان! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔

﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾﴾ ''(دیکھئے) آپ کے ربّ نے آپ کے (قدموں کے) نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾﴾ ''اور آپ اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلائیے' آپ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔''

آیت ۲۶ ﴿فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ﴾ ''پس آپ کھائیے اور پیجئے اور (اپنی) آنکھیں ٹھنڈی کیجیے!''

حضرت مریم سلام علیہا نے یہ تمام معجزات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ بچہ بھی بول پڑا' چشمہ بھی جاری ہو گیا' اور کھجور کے سوکھے تنے کو ہلانے سے تازہ پکی ہوئی کھجوریں بھی ان کے سامنے آن گریں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد ان میں حالات کا مقابلہ کرنے کی جرأت پیدا

ہوئی اور انہوں نے بچے کو لے کر آبادی میں آنے کا فیصلہ کیا۔

﴿فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾﴾ ''اور اگر آپ دیکھیں کسی آدمی کو (اور وہ آپ سے پوچھے) تو اس سے (اشارے سے) کہہ دیں کہ میں نے نذر مانی ہے رحمٰن کے لیے روزے کی' لہٰذا میں بات نہیں کروں گی آج کسی انسان سے۔''

ان کی شریعت میں روزے کی حالت میں کھانے پینے کی پابندی کے علاوہ بات چیت کرنے پر بھی پابندی تھی۔

آیت ۲۷ ﴿فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ﴾ ''پھر وہ لے آئی اس کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس۔''

حضرت مریم بڑے حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے نومولود بچے کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم کی طرف آ گئیں۔ بچے کی گفتگو والا معجزہ دیکھ لینے کے بعد آپ کو تسلی تھی کہ وہ خود ہی لوگوں کے سوالات کے جواب دے گا۔ آیت ۲۴ کے حوالے سے بچے کے کلام کرنے کا تذکرہ عام طور پر تفاسیر میں نہیں ملتا اور ''مِنْ تَحْتِهَا'' سے یہی سمجھا گیا ہے کہ اس موقع پر فرشتے ہی نے آپ کو پکارا تھا۔ بہرحال میری رائے یہ ہے کہ حضرت مریم کو اس وقت نیچے سے پکارنے والا آپ کا نومولود بیٹا تھا' جس کی گفتگو سے آپ کو حوصلہ ملا اور آپ بچے کے ساتھ لوگوں کا سامنا کرنے پر آمادہ ہوئیں۔ واللہ اعلم!

﴿قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـــًٔا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾﴾ ''لوگوں نے کہا: اے مریم! یقیناً تم ایک طوفان گھڑ لائی ہو۔''

ان کو دیکھتے ہی لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کرنا شروع کر دیں کہ تم نے یہ کیا غضب کیا! تمہاری گود میں یہ کس کا بچہ ہے؟ یہ تم نے بہت بری حرکت کی ہے' وغیرہ۔

آیت ۲۸ ﴿يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾﴾ ''اے ہارون کی بہن! نہ تو تمہارا والد برا آدمی تھا اور نہ ہی تمہاری والدہ بدکار تھی۔''

حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہنے کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ ان کا ہارون نامی کوئی بھائی ہو' یا یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے ہونے کی وجہ سے ایک برگزیدہ جدِّ امجد

کے طور پر آپؑ کا نام لیا گیا ہو کہ دیکھو کس عظیم شخصیت کی نسل سے تمہارا تعلق ہے اور حرکت تم نے کس قدر گری ہوئی کی ہے۔

آیت ۲۹ ﴿فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾﴾ ''تو اُس نے اس (بچے) کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم اس سے کیسے بات کریں جو گود میں پڑا بچہ ہے!''

آیت ۳۰ ﴿قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾﴾ ''اُس (بچے) نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں' اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔''

آیت ۳۱ ﴿وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾﴾ ''اور مجھے بابرکت بنایا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں گا' اور مجھے اُس نے تاکید کی ہے نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں زندہ رہوں۔''

آیت ۳۲ ﴿وَّبَرًّا ۢ بِوَالِدَتِيْ ۫ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾﴾ ''اور (اُس نے مجھے بنایا) بھلائی کرنے والا اپنی والدہ کے ساتھ' اور اُس نے مجھے تُند خُو' بدبخت نہیں بنایا۔''

آیت ۳۳ ﴿وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾﴾ ''اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں جنا گیا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن مجھے اٹھایا جائے گا زندہ کر کے۔''

آیت ۳۴ ﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ''یہ ہیں عیسیٰؑ ابن مریم! یہ ہے حق کی بات' جس کے بارے میں یہ لوگ شک کرتے ہیں۔''

آیت ۳۵ ﴿مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۵﴾﴾ ''اللہ کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے' وہ (اس سے) پاک ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے ہو جا' تو وہ ہو جاتا ہے۔''

یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کے سلسلے میں باپ کا حصہ اللہ تعالیٰ کے ایک حرفِ ''کُن'' کے ذریعے سے پورا ہوا' جبکہ باقی سارا عمل عام فطری اور طبعی طریقے سے تکمیل پذیر ہوا۔ اسی لیے آپؑ کو کلمۃٌ مِنہُ (آلِ عمران: ۴۵) یعنی اللہ کا خاص کلمہ قرار دیا گیا ہے۔

آیت ۳۶ ﴿وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ ہی ہے میرا رب بھی اور تمہارا رب بھی' تو تم اُسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔''

آیت ۳۷ ﴿فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾﴾ ''پھر اختلافات پیدا کر لیے (مختلف) گروہوں نے آپس میں۔ تو بربادی ہے ان کافروں کے لیے اس بڑے دن کی پیشی سے۔''

قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ہو گی اور تمام حقائق کھل کر سامنے آئیں گے تو حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں بھی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ چنانچہ اس بارے میں جن لوگوں نے من گھڑت عقیدے بنائے اور پھر ان غلط عقائد پر ہی جمے رہے حتیٰ کہ اسی حالت میں انہیں موت آ گئی' ایسے لوگوں کے لیے اس دن ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

آیت ۳۸ ﴿اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾﴾ ''کیا ہی اچھا وہ سن رہے ہوں گے اور کیا ہی اچھا وہ دیکھ رہے ہوں گے جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے' لیکن آج یہ ظالم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔''

آیت ۳۹ ﴿وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) آپ انہیں خبردار کر دیجیے اس یومِ حسرت سے' جب ہر معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ البتہ (اب) یہ لوگ غفلت میں مبتلا ہیں' لہٰذا یہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا﴾ ''یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کوئی اس پر موجود ہے (اس کے بھی)''

اُس دن روئے زمین کی حکمرانی اور دُنیوی مال و متاع کی ملکیت کے عارضی دعویدار سب کے سب ختم ہو جائیں گے اور اس سب کچھ کی وراثت ظاہری طور پر بھی ہمیں منتقل ہو جائے گی۔

﴿وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''اور یہ سب لوگ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

آیات ۴۱ تا ۵۰

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۘ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۡ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝

آیت ۴۱ ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝۴۱﴾ ’’اور تذکرہ کیجیے اس کتاب میں ابراہیمؑ کا۔ یقیناً وہ صِدّیق نبی تھے۔‘‘

صِدِّیقًا نَبِیًّا ایک نئی ترکیب ہے‘ جو قرآن حکیم میں یہاں پہلی مرتبہ آئی ہے۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور آیت ۵۶ میں حضرت ادریس علیہ السلام کو صِدِّیقًا نَبِیًّا فرمایا گیا ہے‘ جبکہ آیات ۵۱ اور ۵۴ میں بالترتیب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو رَسُوْلًا نَبِیًّا کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ گویا یہ دو الگ الگ تراکیب ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر ایک کا اپنا الگ مفہوم ہے۔ اگرچہ میرے علم کی حد تک ان الفاظ یا تراکیب کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی‘ بلکہ مجھے اس وقت سخت حیرت ہوئی جب میں نے ایک معروف عالمِ دین اور مفسرِ قرآن سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ یعنی کیا واقعی قرآن میں دو انبیاء کے بارے میں صِدِّیقًا نَبِیًّا اور دو کے بارے میں رَسُوْلًا نَبِیًّا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں؟ وہ خود قرآن کی مکمل تفسیر لکھ چکے تھے مگر اس طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بہرحال میں چاہتا ہوں کہ یہ نکتہ جس حد تک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر منکشف فرمایا ہے اس حد تک میں

دوسروں تک پہنچا دوں۔

ان دو تراکیب کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو سورۃ الفاتحہ کی یہ آیات مدنظر رکھیں جن میں ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ’’اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا‘ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا‘‘۔ اور پھر سورۃ النساء کی اس آیت پر غور کریں جس میں ان لوگوں کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝۶۹﴾۔ اس آیت میں ان لوگوں کے چار درجات بیان ہوئے ہیں جو مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان میں سب سے اوپر انبیاء کا درجہ ہے‘ پھر صدیقین کا‘ پھر شہداء کا اور نیچے base line پر صالحین ہیں‘ یعنی نیک دل‘ مخلص مسلمان جو صادق القول اور صادق الایمان ہیں۔ اگر نیچے سے اوپر کی طرف ارتقاء کے حوالے سے دیکھا جائے تو base line پر پہلا درجہ مؤمنین صالحین کا ہے۔ اگر کوئی اس درجہ سے ترقی کرے گا تو اس کے لیے درجہ شہادت ہے اور پھر اس سے اوپر درجہ صدیقیت۔ اس لحاظ سے درجہ صدیقیت گویا کسی بھی انسان کے لیے روحانی ترقی کے مدارج میں بلند ترین درجہ ہے‘ کیونکہ اس کے اوپر نبوت کا درجہ ہے‘ جو اکتسابی نہیں‘ سراسر وہبی ہے اور اب وہ دروازہ نوعِ انسانی کے لیے مستقل طور پر بند ہو چکا ہے۔

صِدّیقین اور شہداء کے فرق کو سائیکالوجی کی دو جدید اصطلاحات کے ذریعے اس طرح سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مختلف مزاج پر پیدا فرمایا ہے۔ مزاج اور رویے کے اعتبار سے جدید سائیکالوجی انسانوں کو بنیادی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہے۔ جو لوگ مجلس پسند ہوں‘ تنہائی سے گھبراتے ہوں‘ ہر وقت سیر سپاٹے کرنے‘ لوگوں سے ملنے جلنے اور خوش گپیوں میں خوش رہتے ہوں‘ انہیں بیروں بیں (extroverts) کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس تنہائی پسند‘ غور و فکر کرنے والے‘ اپنے خیالوں میں مگن رہنے اور محفلوں سے حتی المقدور اجتناب کرنے والے لوگ دروں بین (introverts) کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسری کیفیت ان دو رویّوں کے خوبصورت توازن سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ جن کی شخصیات میں مذکورہ دونوں رویّے توازن کے ساتھ موجود ہوں وہ ambiverts کہلاتے ہیں‘ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ ایک شخص میں دونوں رویّے توازن کے ساتھ موجود ہوں۔ اس

لیے ambiverts قسم کے لوگ عملاً بہت ہی کم ہوتے ہیں اور عمومی طور پر دنیا میں مزاج کے اعتبار سے مندرجہ بالا دو اقسام کے لوگ ہی پائے جاتے ہیں۔ دروں بین (introverts) قسم کے لوگ غور و فکر کی عادت کے باعث فطرت کے حقائق کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ کائنات کے بارے میں سوچ بچار کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی آفاقی آیات اُن سے ہم کلام ہوتی ہیں اور اس سلسلے میں اہم حقائق ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی فطرتِ سلیمہ اور عقل سلیم کی راہنمائی میں اللہ کو بھی پہچان لیتے ہیں' آخرت کی ضرورت اور حقیقت کو بھی سمجھ لیتے ہیں اور یہ بھی جان جاتے ہیں کہ بندگی صرف اللہ ہی کی کرنی چاہیے۔ لیکن بندگی کا طریقہ کیا ہو؟ اس کا انہیں علم نہیں ہوتا۔ اس کے لیے وہ اللہ سے راہنمائی کی التجا کرتے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵﴾ (الفاتحہ)۔ یہ لوگ دراصل صدیقین ہوتے ہیں اور ان کی شان یہ ہے کہ جونہی کوئی الہامی دعوت ان تک پہنچتی ہے وہ اسے اس انداز میں لپک کر قبول کرتے ہیں گویا مدت سے اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا واقعہ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ میں نے جس کے سامنے بھی ایمان کی دعوت پیش کی اس نے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا' سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے۔ یعنی آپؓ نے ایک لمحے کے لیے بھی توقف نہیں کیا اور دعوت پر ایسے لبیک کہا جیسے وہ اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

البتہ بیروں بین (extroverts) قسم کے لوگ چونکہ خود کو کھیل کود' سیر و شکار' میل ملاقات وغیرہ میں مصروف رکھتے ہیں' اس لیے اُن کا طبعی میلان غور و فکر کی طرف نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ کسی الہامی دعوت کو سمجھنے میں ہمیشہ دیر کر دیتے ہیں' اور جب وہ کسی ایسے معاملے کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں تو اکثر جذباتی انداز میں ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ کسی نظریے یا دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو عام طور پر زیادہ متحرک اور فعال ثابت ہوتے ہیں اور یوں مسابقت میں بظاہر introverts سے آگے نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کی دعوت کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جہاں ایک لمحے کے توقف کے بغیر قبول کر لیا وہاں حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کو اس طرف متوجہ ہونے میں چھ سال لگ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو بنو عدی میں سے تھے اور آپؓ کی حضور ﷺ کے ساتھ بظاہر زیادہ قربت نہیں تھی' مگر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تو آپؐ کے سگے چچا اور دودھ شریک تھے۔ وہ بچپن میں آپؐ کے ساتھ کھیلے تھے اور آپؐ سے بہت محبت بھی کرتے تھے' لیکن اس سب کچھ کے باوجود چھ سال تک آپؓ نے حضور ﷺ کی دعوت کی طرف کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا اور جب ایمان لائے تو حادثاتی اور جذباتی انداز میں لائے۔

ایک روز شکار سے واپس آئے تو ابھی گھر میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ لونڈی نے حضور ﷺ سے ابوجہل کی گستاخی کے بارے میں خبر دی۔ بس یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ گھر جانے کے بجائے سیدھے ابوجہل کے پاس پہنچے۔ جاتے ہی اس کے سر پر کمان دے ماری اور اسے للکارا کہ آج سے میں بھی ایمان لے آیا ہوں' تم میرا مقابلہ کر سکتے ہو تو آؤ میدان میں! ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی جذباتی انداز میں ایمان لائے۔ گھر سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ!) قتل کرنے کے ارادے سے نکلے۔ جذبات کی رو میں ہی بہن اور بہنوئی سے جا اُلجھے۔ بہن کی غیر معمولی استقامت دیکھی تو سوچنے پر مجبور ہوئے اور جب سنجیدگی سے غور کیا تو یکدم دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ پھر کیا تھا؟ وہی شمشیر برہنہ جو قتل کے ارادے سے لے کر نکلے تھے' گردن میں لٹکائے غلاموں کی طرح درِ نبوت پر حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ بہرحال اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ دروں بین (introverts) قسم کے لوگ صدیقین اور بیروں بین (extroverts) مزاج کے افراد شہداء ہوتے ہیں۔

انسانی مزاج کا یہ فرق انبیاء کی شخصیات میں بھی پایا جاتا ہے۔ کچھ انبیاء کا مزاج صدیقین سے مناسبت رکھتا ہے اور کچھ کا شہداء سے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں روایات ہیں کہ آپؑ شکار کے بہت شوقین تھے اور اسی شوق میں کئی کئی دن گھر سے باہر رہتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام دو مرتبہ آپؑ سے ملنے کے لیے گئے' مگر آپؑ کے گھر سے باہر ہونے کی وجہ سے دونوں مرتبہ باپ بیٹے کی ملاقات نہ ہو سکی۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مزاج بھی جلالی تھا۔ آپؑ نے مصر میں ایک آدمی کو مُکا رسید کیا تو اس کی جان ہی نکل گئی۔ انسانی مزاج کی اس تشریح کے اعتبار سے میرا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیہما السلام کی شخصیات صدیقیت کے ساتھ مناسبت رکھتی تھیں' اس لیے وہ صدیق نبی قرار پائے' جبکہ حضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی شخصیات شہداء جیسی تھیں' چنانچہ وہ رسول نبی کہلائے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ رسالت اور شہادت کے الفاظ کی آپس میں خصوصی مناسبت ہے۔ ہر رسول کو اپنی قوم کی طرف شاہد بنا کر بھیجا گیا۔ کارِ رسالت یعنی دعوت و تبلیغ اور اتمامِ حجت میں عمل کا پہلو غالب ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں بھی سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۴۵﴾ ''اے نبی! بلاشبہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا''۔ اسی طرح سورۃ

النساء میں بھی ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾﴾ ''پھر کیا حال ہوگا جب ہم لائیں گے ہر اُمت میں سے ایک گواہ اور (اے نبی ﷺ!) آپ کو ہم لائیں گے ان پر گواہ''۔ اس ساری وضاحت کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ مذکورہ آیات میں شہداء کا مزاج رکھنے والے انبیاء کو رَسُولاً نَبِیًّا اور صدیقیت کے مزاج کے حامل انبیاء کو صِدِّیقًا نَبِیًّا کے لقب سے یاد فرمایا گیا ہے۔ سورۃ الحدید کے مطالعے کے دوران اس کی آیت ۱۹: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۚ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ﴾ کے حوالے سے اس موضوع پر ان شاء اللہ مزید گفتگو ہوگی۔

آیت ۴۲ ﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـــًٔا ﴿۴۲﴾﴾ ''یاد کیجیے جب ابراہیم نے اپنے والد سے کہا: ابا جان! آپ کیوں بندگی کرتے ہیں ایسی چیزوں کی جو نہ سن سکتی ہیں اور نہ دیکھ سکتی ہیں اور نہ ہی آپ کے کچھ کام آ سکتی ہیں۔''

اِن آیات کے حوالے سے یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کو مخاطب کرنے کا انداز انتہائی مؤدبانہ ہے: یٰٓاَبَتِ، یٰٓاَبَتِ (اے میرے ابا جان! اے میرے ابا جان!)۔ ایک داعی اور مبلغ کے لیے یہ گویا ایک مثال ہے کہ اگر اسے دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں اپنے سے کسی بڑے یا کسی بزرگ کو مخاطب کرنا ہو تو اس کا طرزِ تخاطب کیسا ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے یہ قرآن مجید کا بہترین مقام ہے۔

آیت ۴۳ ﴿يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ﴾ ''ابا جان! یقیناً میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا''

مجھے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حقائق سے آگاہ کیا ہے۔ میرے پاس وہ ہدایت آئی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان سے ان الفاظ میں وعدہ فرمایا تھا: ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى.....﴾ (البقرہ:۳۸)۔

﴿فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾﴾ ''پس آپ میری پیروی کیجیے، میں آپ کو دکھاؤں گا سیدھا راستہ۔''

آپ میرا کہنا مانیے، میرے پیچھے چلیے، میں یقیناً سیدھے راستے کی طرف آپ کی

راہنمائی کروں گا۔

آیت ۴۴ ﴿يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾﴾ ''ابا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کیجیے، شیطان یقیناً رحمٰن کا نافرمان تھا۔''

اس شیطان کی فرمانبرداری مت کیجیے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے بغاوت اور سرکشی کا ارتکاب کر چکا ہے۔

آیت ۴۵ ﴿يٰٓاَبَتِ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾﴾ ''ابا جان! مجھے اندیشہ ہے کہ رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب آپ کو آ پکڑے اور پھر آپ شیطان ہی کے ساتھی بن کر رہ جائیں۔''

آیت ۴۶ ﴿قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ﴾ ''اُس نے کہا: اے ابراہیم! کیا تم کنارہ کشی کر رہے ہو میرے معبودوں سے؟''

ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لجاجت بھرا طرزِ تخاطب تھا تو دوسری طرف جواب میں باپ کا یہ فرعونی انداز بھی ملاحظہ ہو!

﴿لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾﴾ ''اگر تم اس سے باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا، اور تم مجھے چھوڑ (کر چلے) جاؤ ایک مدت تک۔''

تمہاری یہ باتیں میری برداشت سے باہر ہیں، لہٰذا تم فوری طور پر میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ!

آیت ۴۷ ﴿قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾﴾ ''ابراہیم علیہ السلام نے کہا: آپ پر سلام! میں اپنے رب سے آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا، وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔''

ابراہیم علیہ السلام نے باپ کی طرف سے اتنے سخت جواب کے بعد بھی اپنا اندازِ تخاطب انتہائی مؤدبانہ رکھا، اس سے بھی بڑھ کر آپؑ نے ان کے لیے اپنے مہربان رب سے دعا کرنے کا بھی ارادہ کیا۔ اسی طرح ایک مبلغ اور داعی کو بھی چاہیے کہ وہ مدّمقابل کی طرف سے انتہائی سخت جملوں کے بعد بھی ترش انداز اختیار کرنے کے بجائے نرمی کو ہی اپنائے۔

آیت ۴۸ ﴿وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۡ﴾ ''اور میں کنارہ

کشی کرتا ہوں آپ سے بھی اور اُن (تمام معبودوں) سے بھی جنہیں آپ لوگ اللہ کے سوا پوجتے ہیں اور میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا‘‘

میں تو اپنے رب ہی کی بندگی کروں گا‘ اسی سے دعا کروں گا۔

﴿عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾﴾ ’’مجھے یقین ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہیں رہوں گا۔‘‘

آیت ۴۹ ﴿فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾﴾ ’’پھر جب ابراہیمؑ نے ان سب سے کنارہ کشی کر لی اور ان سے بھی جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے‘ تو ہم نے آپؑ کو عطا کیا اسحاق (جیسا بیٹا) اور یعقوب (جیسا پوتا)‘ اور ہر ایک کو نبی بنایا۔‘‘

آیت ۵۰ ﴿وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾﴾ ’’اور ہم نے ان سب کو اپنی خصوصی رحمت سے حصہ عطا فرمایا اور ان کو اعلیٰ درجے کی سچی شہرت عطا فرمائی۔‘‘

جیسے سورۃ الانشراح میں نبی اکرم ﷺ کو ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿۴﴾﴾ کی سند عطا فرمائی گئی اسی طرح یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آلِ ابراہیمؑ کے ذکرِ خیر کو بہت اعلیٰ سطح پر دنیا میں باقی رکھنے کا ذکر ہے۔ ❁❁❁

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ

توبہ کی عظمت اور تاثیر

اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام

اشاعتِ خاص: 65 روپے　　اشاعتِ عام: 35 روپے

حرمتِ ظلم اور حقیقتِ توحید

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ۱۱/اپریل ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾ (لقمٰن)

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾ (العنکبوت)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ الْغِفَارِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ ' عَنِ النَّبِیِّ ﷺ فِیْمَا یَرْوِیْهِ عَنْ رَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ : اَنَّهٗ قَالَ :

((یَا عِبَادِیْ! اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ ، وَجَعَلْتُهٗ بَیْنَكُمْ مُّحَرَّمًا ، فَلَا تَظَالَمُوْا، یَا عِبَادِیْ! كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَیْتُهٗ ، فَاسْتَهْدُوْنِیْ اَهْدِكُمْ، یَا عِبَادِیْ! كُلُّكُمْ جَائِعٌ اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُهٗ ، فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ اُطْعِمْكُمْ ، یَا عِبَادِیْ! كُلُّكُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ كَسَوْتُهٗ ، فَاسْتَكْسُوْنِیْ اَكْسُكُمْ، یَا عِبَادِیْ! اِنَّكُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِ، وَاَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا، فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ اَغْفِرْ لَكُمْ' یَا عِبَادِیْ! اِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضَرِّیْ فَتَضُرُّوْنِیْ، وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ ، یَا عِبَادِیْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ ، وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ ، كَانُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْكُمْ، مَا زَادَ ذٰلِكَ فِیْ مُلْكِیْ شَیْئًا، یَا عِبَادِیْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ ، وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰی اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْكُمْ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُّلْكِیْ شَیْئًا، یَا عِبَادِیْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ

وَآخِرَكُمْ، وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، قَامُوْا فِیْ صَعِیْدٍ وَاحِدٍ فَسَاَلُوْنِیْ، فَاَعْطَیْتُ كُلَّ اِنْسَانٍ مَّسْاَلَتَهٗ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِیْ اِلَّا كَمَا یَنْقُصُ الْمِخْیَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ، یَا عِبَادِیْ! اِنَّمَا هِیَ اَعْمَالُكُمْ اُحْصِیْهَا لَكُمْ، ثُمَّ اُوَفِّیْكُمْ اِیَّاهَا، فَمَنْ وَّجَدَ خَیْرًا فَلْیَحْمَدِ اللّٰهَ، وَمَنْ وَّجَدَ غَیْرَ ذٰلِكَ فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ))(۱)

سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے حدیث قدسی روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''میرے بندو! میں نے اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے کہ کسی پر ظلم کروں اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا ہے' لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ میرے بندو! تم سب گمراہ ہو سوائے اُس کے جسے میں ہدایت دوں' پس تم مجھ سے ہدایت طلب کرو تو میں تمہیں ضرور ہدایت دوں گا۔ میرے بندو! تم میں سے ہر ایک بھوکا ہے سوائے اُس کے جسے میں کھانا دوں' پس تم مجھ سے کھانا مانگو تو میں تمہیں ضرور کھانا دوں گا۔ میرے بندو! تم میں سے ہر ایک ننگا ہے سوائے اُس کے جسے میں لباس پہناؤں' پس تم مجھ سے لباس طلب کرو تو میں تمہیں لباس دوں گا۔ میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں تمام گناہ معاف کرنے والا ہوں' پس تم مجھ سے مغفرت طلب کرو تو میں تمہیں بخش دوں گا۔ میرے بندو! تم میرے نقصان کو نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچاؤ اور نہ تم میرے نفع کو پہنچ سکتے ہو کہ مجھے کوئی نفع پہنچاؤ۔ میرے بندو! تم میں سے اگلے پچھلے انسان اور جن' اگر سب کے سب اپنے میں سے متقی ترین دل والے شخص کی مانند بن جائیں تو اس سے میری حکومت میں بالکل اضافہ نہ ہوگا۔ میرے بندو! اگر تم میں سے اگلے پچھلے انسان اور جن' سب کے سب اپنے میں سے فاجر ترین دل والے شخص کی مانند بن جائیں تو اس سے میری حکومت میں بالکل کمی نہیں آئے گی۔ میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے انسان اور جن' تمام کے تمام کھلے میدان میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں ہر ایک کو اُس کے مانگنے کے مطابق دیتا جاؤں تو اس سے میرے خزانوں میں بس اتنی سی کمی آئے گی جتنی سمندر میں سوئی

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الظلم۔

ڈبو کر نکالنے سے سمندر میں کمی آتی ہے۔ میرے بندو! یہ تو تمہارے ہی اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لیے محفوظ کر رہا ہوں‘ پھر میں تمہیں ان ہی کی پوری پوری جزا دوں گا‘ پس جو شخص اچھا نتیجہ پائے وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور جسے اچھا نتیجہ نہ ملے تو وہ صرف اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔‘‘

معزّز سامعین کرام!

یہ جو طویل حدیث میں نے آپ کو سنائی ہے‘ یہ اربعین نووی کی حدیث ۲۴ ہے اور یہ حدیث قدسی ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ —— جن کے بارے میں حضور ﷺ کا یہ فرمان ہم حدیث ۱۸ کے مطالعہ میں پڑھ چکے ہیں: ((مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَنْظُرَ اِلٰى تَوَاضُعِ عِيْسٰى فَلْيَنْظُرْ اِلٰى اَبِيْ ذَرٍّ)) ’’جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زہد و تقویٰ دیکھے تو وہ ابوذر کو دیکھ لے‘‘—— اس حدیث قدسی کو حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے اس طویل حدیث قدسی کے الفاظ سے یہ کیفیت محسوس کی ہوگی کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے خطاب کا بڑا ہی محبت بھرا اور بڑی ہی شفقت والا انداز ہے۔

اَللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ

زیر مطالعہ حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں یہ پوری حدیث اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم مبارک ’’اَلْغَنِيّ‘‘ کی تشریح اور وضاحت پر مبنی ہے۔ غَنِی کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی اس کا ترجمہ بے پروا کیا جاتا ہے اور کبھی بے نیاز‘ یعنی اسے نہ کوئی بڑی احتیاج ہے اور نہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی احتیاج ہے۔ الغرض وہ ہر شے سے بے پروا اور بے نیاز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ نام قرآن مجید میں بہت مرتبہ آیا ہے —— ’’غَنِيٌّ حَمِيْد‘‘ تین مرتبہ آیا ہے۔ ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾﴾ (لقمٰن) ’’اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو اللہ غنی اور محمود ہے‘‘۔ یعنی وہ بے پروا بھی ہے اور از خود محمود بھی ہے۔ کوئی اس کی حمد کرے نہ کرے‘ اس کی حمد پوری کائنات کر رہی ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿وَاِنْ مِّنْ

شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ﴾ (بنی اسرائیل: ۴۴) ’’اس کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اللہ کی تسبیح و تحمید نہ کر رہی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے‘‘ —— سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۳ میں ’’غَنِيٌّ حَلِيْمٌ‘‘ بھی آیا ہے: ﴿وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾﴾ ’’اللہ تعالیٰ بہت بے نیاز اور بہت حلیم ہے‘‘۔ یعنی وہ تمہارے گناہوں پر فوراً نہیں پکڑتا بلکہ تمہیں توبہ اور اصلاح کی مہلت دیتا ہے —— اسی طرح سورۃ النحل میں ’’غَنِيٌّ كَرِيْمٌ‘‘ بھی آیا ہے: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾﴾ ’’اور جو کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بہت بے نیاز اور بہت ہی مہربان ہے۔‘‘

’’اَلْغَنِي‘‘ کا لفظ قرآن مجید میں آٹھ مرتبہ آیا ہے اور جو آیات میں نے ابتدا میں تلاوت کیں اُن میں بھی یہ لفظ مذکور ہے۔ اب ان آیات کا مطالعہ کر لیتے ہیں۔ پہلی آیت سورۂ لقمان کی ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ﴾ ’’اور ہم نے لقمان کو حکمت و دانائی عطا کی تھی کہ شکر کر اللہ کا‘‘۔ یعنی دانائی اور حکمت کا بنیادی تقاضا ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر انسان میں پیدا ہو جائے —— سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع ہمارے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا درس ۳ ہے۔ یہ رکوع حکمت قرآنی‘ فلسفہ قرآنی اور خاص طور پر فلسفہ ایمان کے ضمن میں قرآن حکیم کا بہت جامع مقام ہے۔ زیر مطالعہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ہی لقمان کو حکمت و دانائی عطا کی تھی تا کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ آگے فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ﴾ ’’اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو وہ اپنے ہی بھلے کے لیے شکر کرتا ہے‘‘۔ اس کے شکر کرنے میں اللہ کا تو کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ ہی اس شکر سے وہ اللہ کی کوئی ضرورت پوری کر رہا ہے۔ لہٰذا اگر وہ شکر کر رہا ہے تو وہ اپنے بھلے اور اپنے فائدے کے لیے ہی کر رہا ہے‘ بایں طور کہ اگر انسان میں اللہ کے لیے شکر کا مادہ ہے تو اس کی اپنی شخصیت کا صحیح رخ پر اٹھان ہوگا اور درحقیقت یہ اُس کی اپنی صحتِ معنوی‘ صحتِ باطنی اور صحتِ روحانی کی دلیل ہے۔

آگے فرمایا: ﴿وَمَنْ كَفَرَ.....﴾ ’’اور جو کفر کرے.....‘‘ یہاں کفر کے معنی ناشکری کرنے کے ہیں۔ ہم اردو میں بھی ’’کفرانِ نعمت‘‘ بولتے ہیں۔ اس لیے کہ لفظ کفر کا اصل

مفہوم ہے: کسی چیز کو چھپا دینا۔ ''کفارہ'' کی وجہ تسمیہ بھی یہ ہے کہ آپ سے کوئی گناہ ہو گیا اور آپ نے کفارہ ادا کر دیا تو وہ کفارہ آپ کے گناہ کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اسی اعتبار سے کاشت کاروں کو بھی ''کُفّار'' کہا گیا ہے—— قرآن مجید میں ہے: ﴿اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ﴾ (الحدید:۲۰) ''بارش کی اچپائی ہوئی کھیتی کاشت کاروں کو بہت اچھی لگتی ہے''—— اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی بیج کو زمین میں چھپاتا ہے اور پھر وہ پودا بن کر نکلتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اگر احساسِ شکر قلب میں پیدا ہو اور انسان اس کو دبا دے' زبان سے ادا نہ کرے تو یہ کفرانِ نعمت ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی توحید اور اللہ تعالیٰ کے وجود کی گواہی انسان کے باطن میں سے اُبھرے' لیکن انسان اس کو دبا دے تو یہ کفر ہے۔ تو فرمایا: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو اللہ غنی اور محمود ہے''۔ یعنی اللہ کو کسی کے شکر کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔ جبکہ ناشکرا شخص خود اپنا بیڑا غرق کر رہا ہے' اپنی تباہی مول لے رہا ہے اور اپنی عاقبت برباد کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تو از خود محمود ہے' چاہے کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔

''حمد'' کا اصل مفہوم

عام طور پر ہمارے ذہن میں حَمد کا مفہوم تعریف اور ثناء ہے' حالانکہ حمد کا اصل مفہوم ہے: شکر کرنا' تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا معنی ہوگا: کُل شکر' کُل ثناء اور کُل تعریف اللہ کے لیے ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جو دعائیں ہمیں تلقین کی گئی ہیں ان میں شکر کے مقام پر لفظ حمد آتا ہے۔ مثلاً آپ بھوک اور نقاہت محسوس کر رہے تھے' اللہ تعالیٰ نے آپ کو کھانا دیا۔ اب آپ کے اندر قوت اور طاقت لوٹ آئی تو آپ یہ دعا پڑھیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ''کُل شکر اُس اللہ کا ہے جس نے مجھے کھلایا' پلایا اور مجھے مسلمانوں میں سے بنایا''۔ اسی طرح جب صبح ہماری آنکھ کھلتی ہے تو ہم پڑھتے ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ''کُل شکر اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے دوبارہ زندگی عطا کی اس کے بعد کہ مجھ پر موت طاری ہو گئی تھی اور پھر واپس اسی کی طرف لوٹ جانا ہے''۔ نیند میں انسان کا شعور

جاتا رہتا ہے' جبکہ موت میں انسان کی جان چلی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور حضور اکرم ﷺ نے نیند اور موت کو ایک دوسرے کی بہنیں قرار دیا ہے' لہٰذا جب صبح ہماری آنکھ کھلتی ہے تو یہ دعا زبان پر آ جانی چاہیے۔

سیکولرازم' اللہ کے خلاف سب سے بڑی بغاوت

دوسری آیت جو میں نے ابتدا میں آپ کے سامنے تلاوت کی' وہ سورۃ العنکبوت کی آیت ۶ ہے۔ یہ آیت اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں دین کے دوسرے لیول کا ذکر ہے۔ ایک سطح تو یہ ہے کہ انسان اللہ کا شکر بجا لائے' اللہ کے احکام پر چلے' نماز پڑھے' روزہ رکھے' صاحبِ نصاب ہو تو زکوٰۃ ادا کرے اور صاحبِ استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرے۔ اسی طرح حرام سے بچے اور حلال پر اکتفا کرے۔ یہ ایک لیول ہے' جبکہ اس سے اوپر کا معاملہ ہے اللہ کے لیے جہاد کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت' اس کی کبریائی اور اس کی حکومت قائم کرنے کے لیے تَن مَن دھن لگا دینا۔ جیسے کہیں کسی بادشاہ کے خلاف بغاوت ہو جائے تو بادشاہ کے وفادار لوگ کوشش کرتے ہیں کہ بادشاہ کی بادشاہت دوبارہ قائم (restore) ہو جائے۔ آج پوری دنیا میں اللہ کے خلاف بغاوت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دنیا بھر میں سیکولرازم کا اصول سب کے نزدیک مسلّم ہے اور یہ سب سے بڑی بغاوت ہے جو تاریخ انسانی میں اللہ تعالیٰ کے خلاف ہوئی ہے۔

پہلے تو صرف یہ ہوتا تھا کہ ایک بڑے خدا کے ساتھ کچھ چھوٹے چھوٹے خدا بھی نتھی کر دیے جاتے تھے' لیکن اس بڑے خدا کا انکار تاریخ انسانی میں کبھی نہیں ہوا۔ اللہ کو بھی مانتے تھے اور آلہہ کو بھی مانتے تھے۔ ہندوستان میں ''مہادیو'' کو بھی مانتے تھے اور دیوی دیوتاؤں کو بھی۔ یورپ میں God (بڑے ''G'' کے ساتھ) ہمیشہ سے ایک ہی تھا اور اس کی صفات مانی جاتی تھیں: خالقِ کُل (The Omnificent)' قادرِ مطلق (The Omnipotent)' ہر جگہ موجود' حاضر و ناظر (The Omnipresent)' ہر چیز کا جاننے والا' علام الغیوب (The Omniscient)۔ جبکہ اس بڑے خدا (God) کے ساتھ بہت سے دیوی دیوتا (gods & godesses) بھی مانے جاتے تھے۔

اب سب سے بڑی بغاوت یہ ہوئی کہ اللہ کو‘ مہادیو کو‘ یا جس کو بھی تم نے God سمجھا ہے‘ اس کو انسان کی اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا گیا۔ جس طرح ہندوؤں نے مندر میں بت رکھا ہوا ہے کہ لوگ وہاں جاتے ہیں‘ اس کے سامنے ماتھا ٹیکتے ہیں‘ ڈنڈوت کرتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں‘ اسی طرح ہم نے بھی اللہ کو مسجدوں تک محدود کر دیا ہے۔ ہم مسجدوں میں آتے ہیں‘ رکوع و سجود کر لیتے ہیں‘ لیکن باہر جا کر تو ہم اللہ کو اللہ نہیں مانتے۔ ہماری پارلیمنٹ نہیں مانتی‘ ہماری عدالتیں نہیں مانتیں۔ اللہ کا حکم ہے تو ہوا کرے‘ ہم تو اس ملک کے دیوانی اور فوجداری قوانین کے مطابق فیصلے کریں گے۔ جبکہ بنیادی طور پر اس پورے قانون کا ڈھانچہ human law کے اوپر تیار ہوا ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی جِدّوجُہد سے بھی اللہ غنی ہے!

اجتماعی نظام سے اللہ کو بے دخل کیا جانا تاریخ انسانی کی سب سے بڑی بغاوت ہے جو اللہ اور اس کے نظام کے خلاف کی گئی ہے۔ اب اس کو restore کرنے اور اجتماعی نظام کو اللہ کی بادشاہت کے ماتحت کرنے کے لیے جو شخص جدوجہد کر رہا ہے تو یہ بہت ہی اونچا کام ہے۔ انسان کے جتنے بھی افعال ہیں ان میں سے جہاد سب سے اونچی شے ہے‘ لیکن اس کے بارے میں بھی سورۃ العنکبوت کی زیر مطالعہ آیت میں فرما دیا گیا: ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ’’اور جو شخص جہاد کرتا ہے تو وہ اپنے ہی فائدے کے لیے کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تو سارے جہانوں سے بے پروا ہے‘‘۔ یعنی جو کوئی ہماری راہ میں جان و مال کھپاتا ہے‘ مشقتیں اور مصیبتیں برداشت کرتا ہے —— از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ﴾ ’’اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہنے والے‘‘ —— اسے بھی کبھی یہ خیال نہ آ جائے کہ وہ ہم پر کوئی احسان کر رہا ہے‘ یا اس سے ہماری کوئی ضرورت پوری ہو رہی ہے‘ یا معاذ اللہ! ہمارے کسی معاملے میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا جسے وہ درست کر رہا ہے۔ الغرض جو جہاد کر رہا ہے وہ اپنے بھلے کے لیے کر رہا ہے اور اس کا سارا اجر و ثواب اسی کو ملے گا‘ اسی کی عاقبت سنورے گی اور اللہ تعالیٰ

کے ہاں اس کو بلند سے بلند تر مقامات جنت میں حاصل ہوں گے۔ گویا قرآن مجید ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے غنی ہونے کا تصور دیتا ہے کہ مخلوق میں سے کوئی بھی‘ کسی درجے میں بھی اور کسی اعتبار سے بھی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اس کا محتاج ہے۔

معاملات کی اہمیت مسلّم ہے!

اب آیئے اس حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں سب سے پہلی بات انسانی معاملات کی درستگی سے متعلق آئی ہے‘ اس لیے کہ ہمارے دین میں عبادات اور معاملات دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ عام مذہبی ذہن عبادات کو زیادہ اہمیت دیتا ہے کہ نماز روزہ کے بارے میں ذرا کمی بیشی ہو جائے تو وہ بہت فکرمند ہوتے ہیں —— مثلاً جو رفع یدین کو ضروری سمجھتے ہیں وہ رفع یدین نہ کرنے والوں کی طرف سے بُعد محسوس کر رہے ہوتے ہیں‘ لیکن معاملات کے بارے میں وہ اتنے حساس نہیں ہوتے‘ حالانکہ دین کے اعتبار سے اہم تر چیز معاملات ہیں۔ اس لیے کہ تم نے اگر ایک دوسرے پر کوئی زیادتی کی ہے تو اس زیادتی کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتا‘ بلکہ تمہیں ہی کسی نہ کسی حیثیت میں اس کی تلافی (compensation) کرنا پڑے گی۔ اگر تم نے دنیا میں ہی اس زیادتی کا بدلہ چکا دیا تو ٹھیک‘ ورنہ قیامت کے دن تمہاری نیکیاں اس کے حوالے کر دی جائیں گی جس کا حق تمہارے ذمہ ہے‘ اور اگر تمہاری نیکیاں کم ہوں گی تو پھر حق داروں کے گناہ تمہارے حساب میں درج ہوں گے۔ الغرض انسانی معاملات کے ضمن میں یہ ڈیبٹ کریڈٹ ہوتا رہے گا۔ البتہ عبادات کے معاملے میں اللہ غنی ہے اور عبادات میں کمی کوتاہی کو اللہ معاف فرماتا ہے۔ اگرچہ اسے اس کا پورا حق ہے‘ لیکن وہ بہت بلند و بالا ہے کہ اپنے حق کے بارے میں آپ سے جھگڑے۔ البتہ ایک دوسرے پر تم نے اگر کوئی تعدّی‘ کوئی ظلم‘ کوئی حق تلفی‘ کوئی زیادتی کی ہے تو اس کے بارے میں لازماً پکڑ ہو جائے گی۔

معاملات کی اسی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے زیر مطالعہ حدیث میں سب سے پہلی بات انسانی معاملات ہی سے متعلق آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((يَا عِبَادِيْ! اِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ))

''اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام ٹھہرالیا ہے۔''

ظلم یہ بھی ہے کہ کسی کو اس کے اچھے عمل کا بدلہ نہ دیا جائے اور ظلم یہ بھی ہے کہ کسی کو ایسے جرم کی سزا دی جائے جو اُس نے کیا ہی نہیں ہے۔ دنیا میں تو ایسا ہوتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ظلم کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔

((وَجَعَلْتُهٗ بَيْنَكُمْ مُّحَرَّمًا ، فَلَا تَظَالَمُوْا))

''اور میں نے تم پر بھی آپس میں ظلم کو حرام کر دیا ہے' پس تم بھی ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔''

لہٰذا کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔ جان لو کہ اگر کسی کے بارے میں سوئے ظن کر رہے ہو تو یہ بھی زیادتی کر رہے ہو جب تک کہ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہ ہو۔ کسی کی غیبت کر رہے ہو تو یہ بھی بہت بڑا ظلم ہے۔ تمہارا یہ فعل ایسا ہی ہے گویا تم اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہو۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ﴾ ''کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یہ تو تمہیں بہت ناگوار لگے گا (پس تم غیبت نہ کرو)''۔ اسی طرح تم نے کسی کا مال مار لیا ہے' کسی کو دھوکہ دے کر کوئی شے زیادہ دام میں فروخت کر دی ہے' کسی نے اپنی بہنوں کا وراثتی حصہ ہڑپ کر لیا ہے تو یہ ظلم ہے۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنی ذات پر بھی ظلم کو حرام کیا ہے اور تمہارے مابین بھی ظلم کو حرام ٹھہرایا ہے' لہٰذا تم بھی ایک دوسرے پر کسی قسم کا ظلم نہ کرو!

کُلّی اور جُزوی ہدایت

اس کے بعد فرمایا:

((يَا عِبَادِيْ! كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُهٗ))

''تم میں سے ہر شخص گمراہ ہے سوائے اُس کے جس کو میں ہدایت دے دوں۔''

دیکھئے' ایک کلی ہدایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام اور ایمان کی طرف ہمیں ہدایت دے دی۔ پھر ایک جزوی ہدایت ہوتی ہے۔ ہر قدم پر اور ہر چوراہے پر یہ کشمکش آ جاتی ہے کہ

یہ کریں یا یہ کریں! تو اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی محسوس ہو کہ ہدایت ملی ہے تو اللہ کے شکر کا کلمہ زبان سے نکلنا چاہیے: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (الاعراف:۴۳) ''اور کہیں گے کہ کُل شکر اور کُل حمد و ثناء اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت بخشی' اور ہم ہرگز ہدایت یافتہ نہ ہو سکتے تھے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتا۔''

((فَاسْتَهْدُوْنِيْ اَهْدِكُمْ))

''پس مجھ سے ہدایت طلب کرتے رہا کرو' میں تمہیں ہدایت دوں گا۔''

اسی طلبِ ہدایت کا ذکر سورۃ الفاتحہ میں ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ ''(اے اللہ!) سیدھے راستے کی طرف ہماری راہنمائی فرما''۔ آپ کو معلوم ہے جو شخص یہ دعا مانگ رہا ہے وہ اللہ سے' اللہ کی توحید سے اور اس کی صفات سے واقف ہے۔ پھر وہ یومِ قیامت کو بھی مانتا ہے' اللہ کی رحمانیت' رحیمیت کو مانتا ہے اور اُس کے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ہونے کو بھی مانتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس بات کا بھی اقرار کر رہا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ''(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں''—— ان سب کے ہوتے ہوئے وہ کون سی ہدایت چاہتا ہے' اس کو سمجھ لیجیے۔ انسان ہر ہر قدم پر دوراہے پر آ جاتا ہے اور بسا اوقات دو چیزوں میں بہت باریک سا فرق ہوتا ہے' جیسے کہ تکبر اور عزتِ نفس میں بڑا باریک سا فرق ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی شخص اپنی عزتِ نفس کے اعتبار سے کوئی طرزِ عمل اختیار کر رہا ہو' جبکہ دیکھنے والے سمجھیں گے کہ اس میں تکبر ہے۔ ایسے معاملات میں نیت کا اعتبار ہوگا اور انسان کا معاملہ اس کی نیت کے حوالے سے ہی اللہ کے ہاں آئے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے کلی ہدایت کے ساتھ ساتھ جزوی ہدایت بھی طلب کرنی چاہیے۔

اے میرے بندو! مجھ سے مانگو' میں تمہیں دوں گا

اس کے بعد وہ اصل معاملہ آ گیا جو میں نے کہا تھا کہ یہ حدیث اسم مبارک ''اَلْغَنِیّ'' کی تشریح پر مشتمل ہے۔ فرمایا:

((یَا عِبَادِیْ! کُلُّکُمْ جَائِعٌ اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُهٗ ، فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ اُطْعِمْکُمْ))

''اے میرے بندو! تم میں سے ہر شخص بھوکا ہے سوائے اُس کے جسے میں کھلاؤں' پس تم مجھ ہی سے کھانا مانگو' میں تمہیں کھانا ضرور دوں گا۔''

یعنی کھانے پینے اور رزق کی طلب مجھ سے کیا کرو' میں مزید دوں گا' اس لیے کہ میرے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔

((یَا عِبَادِیْ! کُلُّکُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ کَسَوْتُهٗ ، فَاسْتَکْسُوْنِیْ اَکْسُکُمْ))

''اے میرے بندو! تم سب کے سب ننگے ہو' سوائے اُس کے جسے میں لباس عطا کروں' پس تم مجھ سے لباس طلب کرو۔''

((یَا عِبَادِیْ! اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَاَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا، فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ اَغْفِرْ لَکُمْ))

''اے میرے بندو! تم دن رات خطائیں کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو معاف کرنے والا ہوں۔ پس تم مجھ سے مغفرت چاہو' میں تمہیں (یعنی تمہارے سارے گناہوں کو) معاف کردوں گا۔''

یعنی تم سے رات اور دن میں تقصیرات اور کوتاہیاں ہوتی رہتی ہیں' گناہ سرزد ہوتے ہیں' تو تم مجھ سے معافی مانگو' میں تمہاری معافی قبول کرنے والا ہوں۔ جیسے ایک حدیث میں آتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((کُلُّ بَنِیْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ)) (۱)

''تمام بنی آدم بہت خطا کار ہیں' لیکن ان خطا کاروں میں بہتر وہ ہیں جو بار بار توبہ کرنے والے ہیں۔''

خَطَّاء 'فَعَّال کے وزن پر (قَهَّار کی طرح) مبالغے کا صیغہ ہے' لہٰذا اس کے معنی انتہائی خطا کار کے ہیں۔ یہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سب کے سب انتہائی خطا کار ہو' بایں طور کہ تم دن رات خطائیں کرتے ہو' لیکن گناہوں کی کثرت کے باوجود اگر کوئی خطا کار توبہ کرلے تو ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں اور اللہ ایسے لوگوں کے تمام گناہ

(۱) سنن الترمذی' ابواب صفة القیامة والرقائق والورع۔

معاف فرما دیتا ہے—— اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَاهْدِنَا وَارْزُقْنَا!

آگے فرمایا:

((یَا عِبَادِیْ! اِنَّکُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضَرِّیْ فَتَضُرُّوْنِیْ))

''اے میرے بندو! تم ہرگز میرے نقصان کو نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے نقصان پہنچاؤ۔''

تمہاری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے کہ تم مجھے کوئی نقصان پہنچا سکو۔ تم اگر کفر کر رہے ہو تو اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے' اسی طرح اگر تم میری جناب میں گستاخیاں کر رہے ہو تو یہ گستاخیاں بھی میرے کسی نقصان کا باعث نہیں ہیں۔

((وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ))

''اور نہ ہی تم میرے نفع کو پہنچ سکتے ہو کہ مجھے نفع پہنچاؤ۔''

یہ بات بھی اللہ کی اس صفت کا مظہر ہے کہ وہ الغنی ہے اور اسے کسی کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔

اللہ ربّ العزت کی شانِ بے نیازی

زیر مطالعہ حدیث میں آگے جو الفاظ آ رہے ہیں وہ اس حدیث کا ذروۂ سنام (climax) ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((یَا عِبَادِیْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ ، وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ ، کَانُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ مَا زَادَ ذٰلِكَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئًا))

''اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے' اور انسان اور جن' سب کے سب تم میں سے متقی ترین دل والے شخص کی مانند بن جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔''

گویا پوری نوعِ انسانی' پہلے بھی اور پچھلے بھی' اور جن اور انس بھی' سب کے سب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے بن جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا —— آگے ربّ العزت نے فرمایا:

((یَا عِبَادِیْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ ، وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْکُمْ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُّلْکِیْ شَیْئًا))

''اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے' اور انسان اور جن' سب کے سب تم میں سے فاجر ترین دل والے شخص کی مانند ہو جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

یعنی اگر سب کے سب ابوجہل بن جائیں یا شیطانِ لعین اور عزازیل بن جائیں' تب بھی میری سلطنت میں کوئی کمی نہیں آئے گی ـــــ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((یَا عِبَادِیْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ، وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ، قَامُوْا فِیْ صَعِیْدٍ وَاحِدٍ فَسَاَلُوْنِیْ، فَاَعْطَیْتُ کُلَّ اِنْسَانٍ مَّسْاَلَتَهٗ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِیْ اِلَّا کَمَا یَنْقُصُ الْمِخْیَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ))

''اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے' اور انسان اور جن' سب کے سب ایک میدان میں جمع ہو کر اپنی پہنچ کے مطابق مجھ سے سوال کریں اور میں ان کے مانگنے کے مطابق انہیں دیتا جاؤں تو اس سے میرے خزانوں میں بس اتنی سی کمی واقع ہوگی جتنی سمندر میں سوئی ڈبو کر نکالنے سے سمندر میں کمی آتی ہے۔''

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ یہ حدیث اللہ ربّ العزت کی شانِ استغناء سے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے بالکل بے نیاز ہے۔ اس کی کوئی احتیاج' چھوٹی سے چھوٹی' بڑی سے بڑی' کسی بھی مخلوق سے یعنی کسی انسان' کسی جن اور کسی فرشتے سے نہیں ہے۔

زیر مطالعہ حدیث کا آخری حصہ

زیر مطالعہ حدیث کے آخری ٹکڑے میں قیامت کے دن ہونے والے حساب وکتاب اور جزا و سزا کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((یَا عِبَادِیْ! اِنَّمَا هِیَ اَعْمَالُکُمْ اُحْصِیْهَا لَکُمْ، ثُمَّ اُوَفِّیْکُمْ اِیَّاهَا))

''اے میرے بندو! یہ تو تمہارے اعمال ہیں جن کو میں محفوظ کر کے رکھ رہا ہوں' پھر میں تمہیں ان ہی کی پوری پوری جزا دوں گا۔''

مجھے کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ اسے اپنی دشمنی کی وجہ سے جہنم میں ڈالوں۔ مجھے کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا ہے کہ میں اس کو جہنم میں جھونک کر اپنے اس نقصان کی تلافی کروں۔ مجھے تو کوئی احتیاج نہیں' البتہ تمہارے اعمال میرے پاس محفوظ ہو رہے ہیں اور کل

قیامت کے دن میں تمہیں ان کا بدلہ ضرور دوں گا۔ اس ضمن میں سورۃ الزلزال میں فرمایا گیا: ﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝﴾ ''جس کسی نے ذرّے کے برابر بھی خیر کمایا ہوگا تو وہ اسے اپنے سامنے موجود پائے گا' اور جس کسی نے ذرّے کے برابر بھی برائی کمائی ہوگی تو وہ بھی اسے اپنے سامنے موجود پائے گا'' ـــــ ''ذرّہ'' کسے کہتے ہیں' اس کو بھی جان لیجیے۔ آج کل تو خیر ہمارے تصورات میں ایٹم وغیرہ بھی آ جاتا ہے' جبکہ پہلے زمانے میں سب سے چھوٹی چیز جو انسان اپنی آنکھ سے دیکھتا تھا وہ چیونٹیوں کے نوزائیدہ بچے تھے اور ان کو ''ذرّات'' (واحد ''ذرّہ'') کہا جاتا ہے۔

آگے فرمایا:

((فَمَنْ وَّجَدَ خَیْرًا فَلْیَحْمَدِ اللّٰهَ))

''پس جو شخص (اپنے اعمال نامہ میں) کوئی خیر پائے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔''

اس لیے کہ بہرحال ہدایت اور نیکی کی توفیق تو اللہ نے ہی دی تھی تو پھر اس پر شکر بھی لازم ہے۔ جیسے کہ ابھی میں نے سورۃ الاعراف کی یہ آیت آپ کو سنائی: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾۔ یہ دراصل اہلِ جنت کا ترانۂ حمد ہے۔ اہلِ جنت' جب جنت میں داخل ہوں گے تو اُس وقت ان کے قلب کی گہرائیوں سے یہ ترانہ حمد اُبھر کر آئے گا۔ اس لیے کہ اہل ایمان دنیا میں تو ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور کسی کو اپنے عمل پر کوئی غرور اور کوئی اعتماد نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر وقت آسان حساب کی دعا مانگتے رہتے ہیں' اس لیے کہ اگر کہیں تفصیل سے محاسبہ شروع ہو گیا تو پھر کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو اللہ کے ہاں کامیاب ہو سکے۔

اس ضمن میں یہ حدیث بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ((لَنْ یُّدْخِلَ اَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ)) ''تم میں سے کسی شخص کا عمل اسے ہرگز جنت میں داخل نہیں کرے گا (جب تک کہ اللہ کی رحمت اس کی دستگیری نہ فرمائے)''۔ اب کسی صحابی نے بڑی ہمت' حوصلے اور جرأت سے کام لیتے ہوئے پوچھ لیا: وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ

اللّٰہِ! ''یارسول اللہ ﷺ! کیا آپؐ بھی؟ (اعمال کی بنیاد پر جنت میں داخل نہیں ہو سکتے)''۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ((لَا وَلَا اَنَا' اِلَّا اَنْ یَتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِفَضْلٍ وَّرَحْمَۃٍ))(۱) ''ہاں میں بھی' اِلا یہ کہ اللہ عزوجل اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت کی چادر سے مجھے ڈھانپ دے۔''

غلوِعقیدت اور غلوِمحبت سے احتراز لازم ہے!

دیکھئے' حضور اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل واحسان اور اس کی رحمت کے بغیر میرا داخلہ بھی جنت میں نہیں ہو سکتا اور یہی ہمارے دین کی تعلیم ہے' جبکہ ہمارے ذہنوں میں انبیاء ورسل کی شانوں میں کس کس درجے کے مغالطے ہوتے ہیں۔ یہ غلوِعقیدت اور غلوِمحبت ہی تو ہے کہ جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا ڈالا۔ یہ کسی بدنیتی کا نتیجہ نہیں ہے' بلکہ یہ محبت اور عقیدت کا غلو ہے۔ پھر اسی غلو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کا اوتار بنوا ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قیامت تک محفوظ رکھنا تھا' لہٰذا یہ گستاخی حضور ﷺ کی شان میں کسی نے نہیں کی کہ حضور ﷺ کو اللہ کا اوتار قرار دیا ہو۔ ویسے تو ایسے بے شمار اشعار ہیں جن میں حضور اکرم ﷺ کی شان بیان کرتے ہوئے غلو سے کام لیا گیا ہے' مثلاً:

وہی جو مستوئ عرش تھا خدا ہو کر
اُتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر☆

(۱) صحیح البخاری' کتاب المرضی' باب تمنی المریض الموت' ح: ۵۶۷۳ ۔ وصحیح مسلم' کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار' باب لن یدخل احد الجنۃ بعملہ.....' ح:۲۸۱۸۔

☆ اسی طرح ایک شعر کچھ یوں ہے:؎

مدینے کی مسجد میں منبر کے اوپر بغیر عین کے اک عرب ہم نے دیکھا!

''عرب'' کے لفظ سے اگر ''ع'' کو ہٹا دیا جائے تو باقی ''رب'' بچتا ہے۔ ہمارے نعت خواں حضرات تو حضور ﷺ سے عشق ومحبت کے اظہار میں اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) حضور ﷺ کو ربّ کے برابر بٹھائے بغیر اپنے عشق ومحبت کو مکمل ہی نہیں سمجھتے۔ (مرتب)

لیکن یہ صرف شاعری کا معاملہ ہے اور شعروں میں تو غلو ہوتا ہی ہے۔ اس سے تو کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس ضمن میں فرمایا گیا: ﴿وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾﴾ ''اور شاعروں کی پیروی تو گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں رہتے ہیں' اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں!''

حضور اکرم ﷺ کو شعروں میں تو خدا کے برابر بٹھا دیا گیا' مگر بالفعل کسی نے حضور کو اللہ کا اوتار قرار نہیں دیا' جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا ماننے والے پیدا ہوئے اور عبداللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ فتنہ کھڑا کیا تھا۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ شام اور لبنان کے اندر ایسے لوگ آج بھی موجود ہیں جو علوی وغیرہ کہلاتے ہیں اور جن کا عقیدہ ہے کہ علی اللہ ہی کے اوتار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ میں صرف اس اعتبار سے بتا رہا ہوں کہ حضور ﷺ کے مقابلے میں حضرت علیؓ کی کیا حیثیت ہے! بہرحال حضور ﷺ کو اللہ نے محفوظ رکھا' اس لیے کہ سارے دین کا معاملہ آپ ﷺ کے ساتھ وابستہ ہے۔؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

حضرت علیؓ حضور ﷺ کے صحابی ہیں' ان کی آپؐ نے تربیت فرمائی' تزکیہ فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی گود میں پلے ہیں۔ تو یہ گستاخی حضرت علیؓ کے ساتھ کی گئی ہے' لیکن اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو اس سے بچایا ہے۔

''تم ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کی پیروی کرو گے!''

عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دینا عقیدت ومحبت کا غلو ہے۔ یہی غلو ہمارے ہاں بھی چلا آ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی سرشت بدلتی نہیں ہے۔ پہلے والے انسان جس طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے تھے' ایسے ہی آج بھی ہو گئے ہیں۔ ایک حدیث میں تو رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرما دیا:

((لَتَرْكَبُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ وَبَاعًا بِبَاعٍ

حَتّٰی لَوْ اَنَّ اَحَدَھُمْ دَخَلَ جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمْ وَحَتّٰی لَوْ أَنَّ أَحَدَھُمْ جَامَعَ أُمَّهُ لَفَعَلْتُمْ)) (۱)

’’تم ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کی پیروی کرو گے بالشت در بالشت‘ ہاتھ در ہاتھ اور باع (دونوں ہاتھوں کی لمبائی) در باع‘ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے بل میں گھسا ہوگا تو تم بھی ضرور گھسو گے۔ اور اگر ان میں سے کسی بدبخت نے اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کی ہوگی تو تم بھی ایسا ضرور کرو گے۔‘‘

امام بخاری و مسلم کی نقل کردہ روایت کے آخر میں صحابہ کرام ؓ کا یہ سوال بھی درج ہے کہ انہوں نے پوچھا: ((یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَلْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی؟)) ’’اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا پہلے لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ؟)) ’’تو اور کون مراد ہیں؟‘‘ یعنی تم سے پہلے کی اُمت یہود و نصاریٰ ہی تو ہیں۔ اور وہ اُمت مسلمہ بھی تھے۔ ہم اس زعم میں نہ رہیں کہ ہم ہی امت مسلمہ ہیں۔ وہ جو غالب نے کہا تھا کہ ؎

ریختہ کے تم ہی اُستاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا!

اسی طرح صرف ہم ہی اُمت مسلمہ نہیں ہیں‘ بلکہ ہم سے پہلے یہود بھی امت مسلمہ تھے۔ اور نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں چار مقامات پر ان ہی یہودیوں کے بارے میں آیا ہے کہ ہم نے انہیں تمام انسانوں پر فضیلت دی۔ دو مرتبہ سورۃ البقرۃ میں آیا ہے‘ چنانچہ سورۃ البقرۃ کے چھٹے رکوع کی پہلی آیت اور پندرہویں رکوع کی پہلی آیت کے الفاظ یکساں ہیں:

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾

’’اے یعقوب کی اولاد! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے تھے اور یہ کہ میں نے تم کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی‘ لیکن ان میں گمراہیاں پیدا ہوگئیں اور ان کی ایک بڑی گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے تورات میں تحریفات کیں۔

(۱) السلسلة الصحيحة للالبانی‘ ح ۱۳۴۸۔ و مجمع الزوائد للهيثمی۔ راوی: عبداللّٰہ بن عباسؓ۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ قرآن مجید کی حفاظت اپنے ذمے لے لی تو یہ اُمت اس گمراہی سے بچی ہوئی ہے‘ لیکن یہ حفاظت صرف متن قرآن کو حاصل ہے۔ ترجموں اور تفسیروں میں تحریفیں ہوئی ہیں اور ڈٹ کر ہوئی ہیں۔ جیسے اقبال نے کہا ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

البتہ قرآن مجید کے متن کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی‘ اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی حفاظت میں ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ۹﴾ (الحجر) ’’بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہم نے اُتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں‘‘۔ ورنہ نوٹ کر لیجیے کہ اگر تورات اور انجیل کی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ اپنے ذمے لے لیتا تو کیا ان میں کوئی تحریف ہو سکتی تھی؟ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حفاظت میں قرآن مجید کو نہ لے لیا ہوتا تو کیا ہم قرآن میں تحریف سے باز رہتے؟

حرفِ آخر

ہم زیر مطالعہ حدیث قدسی کے آخری الفاظ پر گفتگو کر رہے تھے:

((یَا عِبَادِیْ! اِنَّمَا ھِیَ اَعْمَالُکُمْ اُحْصِیْھَا لَکُمْ، ثُمَّ اُوَفِّیْکُمْ اِیَّاھَا))

’’اے میرے بندو! یہ تو تمہارے ہی اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لیے گن گن کر محفوظ کر رہا ہوں‘ پھر میں تمہیں ان کی پوری پوری جزا دوں گا۔‘‘

وَفّٰی ، یُوَفِّیْ: پورا پورا دینا‘ پورے اہتمام سے دینا۔ اَوْفٰی یُوْفِیْ (باب افعال سے) کے معنی بھی یہی ہیں کہ پورا پورا دینا‘ لیکن باب افعال کے مقابلے میں باب تفعیل کے اندر بہت وزن ہوتا ہے اور اس کا معنی ہے: رفتہ رفتہ پورا پورا دینا۔ چنانچہ اُوَفِّیْکُمْ اِیَّاھَا کا مطلب یہ ہوگا کہ میں قیامت کے دن تمہارے اعمال کا بدلہ پورے کا پورا‘ بلاکم و کاست تمہیں عطا کر دوں گا۔ ((فَمَنْ وَّجَدَ خَیْرًا فَلْیَحْمَدِ اللّٰہَ)) ’’تو جو کوئی اپنے اعمال نامے میں خیر پائے تو وہ اللہ کی حمد کرے‘‘۔ اس لیے کہ اللہ ہی نے توفیق دی تھی اور اللہ ہی کے فضل و کرم سے تم نے وہ نیکی کے کام کیے تھے۔ اگر اللہ تمہیں نیکی کی توفیق

نہ دیتا تو تم وہ کام کیسے کر سکتے تھے‘ لہٰذا اُس کا شکر لازم ہے۔ آگے فرمایا:

((وَمَنْ وَّجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ))

’’اور جو کوئی اس کے سوا پائے (یعنی شر‘ بدی اور برائی پائے) تو وہ اپنے نفس کے علاوہ کسی کو ملامت نہ کرے۔‘‘

اس لیے کہ اس کا کمانے والا وہ خود ہے‘ لہٰذا وہ کسی اور کے اوپر اس کا الزام نہ دھرے اور اس کی پوری ذمہ داری خود ہی قبول کرے۔

زیر مطالعہ طویل حدیث قدسی میں ’’یَا عِبَادِیْ‘‘ (اے میرے بندو!) کی تکرار جس کیفیت سے ہوئی ہے یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر شفقت کا مظہر ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ﴾ (النساء:۱۴۷) ’’اللہ کو کیا لینا ہے تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر کی روش اختیار کرو اور (صدقِ دل سے) ایمان لے آؤ‘‘۔ تو اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ کسی کو تکلیف دے کر اسے کوئی خوشی حاصل ہوتی ہو۔ یہ تو تمہارے اپنے اعمال ہیں جو ہم نے حفاظت کے ساتھ گن کر رکھے ہوئے تھے۔ آج ہم نے وہ اعمال تمہارے سامنے حاضر کر دیے ہیں تو جو ان میں خیر پائے وہ اللہ کی حمد کرے‘ اللہ کا شکر ادا کرے‘ اور جو اس میں شر پائے تو وہ سوائے اپنے نفس کے کسی کو ملامت نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس حدیث کے مندرجات کو سمجھنے اور اس پر صحیح معنوں میں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

اقول قول هذا واستغفر اللّٰه لی ولكم ولسائر المُسلمين والمُسلمات○○

(مرتب: حافظ محمد زاہد‘ ادارتی معاون‘ شعبہ مطبوعات)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

درس ۱۰

نظمِ جماعت کی پابندی
اور
اس سے رُخصت اور معذرت کا معاملہ

انجینئر حافظ نوید احمد ☆

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (النور)

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِىْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝

☆ مرکزی ناظم تعلیم وتربیت، تنظیم اسلامی naveed.ahmad@quranacademy.com

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّىْ وَلَا تَفْتِنِّىْ ؕ اَلَا فِى الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ (التوبۃ)

تمہیدی نکات

۱) منتخب نصاب نمبر۲ کا درسِ دہم سورۃ النور کی آیات ۶۲ تا ۶۴ اور سورۃ التوبہ کی آیات ۴۳ تا ۴۹ کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔

۲) منتخب نصاب نمبر۲ کے سابقہ دروس میں یہ حقیقت ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک ایسی دینی جماعت میں شمولیت لازم ہے جو مضبوط نظم کی حامل ہو۔ دینی فرائض ڈھیلی ڈھالی نظم والی جماعت سے ادا نہیں ہو سکتے۔ اِن فرائض کی ادائیگی کے لیے نظامِ باطل سے تصادم ناگزیر ہے اور تصادم کے مرحلے میں مضبوط نظم والی جماعت ہی ڈٹ کر کھڑی رہ سکتی ہے۔ ان شاء اللہ اب درسِ دہم میں ہم اِس جماعت کے نظم کی پابندی کی اہمیت کو سمجھیں گے۔

۳) اِس درس میں ہم نے دو ایسے مقاماتِ قرآنی کا مطالعہ کرنا ہے جن کے مضمون میں بظاہر تضاد محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ تضاد نہیں ہے بلکہ دو مختلف صورتوں کے پس منظر میں الگ الگ طرزِ عمل کا بیان ہے۔ ان شاء اللہ مطالعہ کے دوران ہم بظاہر محسوس ہونے والے تضاد کو رفع کرنے کی کوشش کریں گے۔

آیات پر غور و فکر

سورۃ النور، آیت ۶۲

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ”بے شک مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لے آئے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر“..... ﴿وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ﴾ ”اور

جب وہ ہوتے ہیں اُن کے ساتھ کسی اجتماعی کام پر‘‘......﴿لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ﴾ ’’وہ نہیں جاتے جب تک وہ اجازت نہ لے لیں آپؐ سے‘‘......﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) بلاشبہ جو اجازت لیتے ہیں آپؐ سے‘‘......﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ﴾ ’’یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور اُس کے رسولؐ پر‘‘...... ﴿فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ﴾ ’’تو جب وہ اجازت لیں آپؐ سے اپنے کسی کام کے لیے‘‘......﴿فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ﴾ ’’تو آپؐ اجازت دیں جسے آپؐ چاہیں اُن میں سے‘‘ ...... ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ﴾ ’’اور بخشش مانگیے اُن کے لیے اللہ سے‘‘...... ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾﴾ ’’بے شک اللہ بہت بخشنے والا‘ ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔‘‘

- اِس آیت مبارکہ میں نظم کی پابندی کے حوالے سے مؤمنانہ طرزِ عمل کا بیان ہے۔ انتہائی تاکیدی اسلوب میں دو بار یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ حقیقی مؤمن صرف وہی لوگ ہیں جو ذاتی مصروفیات کی قربانی دے کر اجتماعی کاموں کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ پھر اجتماعی کام کو چھوڑ کر نہیں جاتے جب تک رسول اللہ ﷺ سے اجازت نہ لے لیں۔ گویا اُنہیں اجتماعی کام کی اہمیت کا اور اِس کام کے حوالے سے نظم کی پابندی کا پوری طرح سے احساس ہے۔ یہ احساس ہی درحقیقت اُن کے دلوں میں ایمان ہونے کی علامت ہے۔
- پھر یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے اِس اختیار کا ذکر کر رہی ہے کہ جب مؤمنین اپنے کسی معاملے یا عذر کی وجہ سے آپ ﷺ سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کریں تو آپ ﷺ اُن میں سے جسے چاہیں اجازت دیں اور جسے چاہیں اجازت نہ دیں۔ یہ فیصلہ آپ ﷺ نے کرنا ہے کہ کسی کا عذر قابلِ قبول ہے یا نہیں اور کسی کا معاملہ فوری رخصت کا تقاضا رکھتا ہے یا نہیں۔ کسے رخصت دینا نقصان دہ یا خلافِ مصلحت ہے اور کسے رخصت دینے میں کوئی قباحت نہیں۔
- آیت کے آخر میں نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تلقین کی گئی کہ آپؐ رخصت طلب کرنے والوں کے لیے دُعائے استغفار کریں۔ سوچنے کی بات ہے کہ اُنہوں نے کون سا ایسا گناہ کیا ہے کہ جس کے لیے استغفار کی ضرورت ہے۔ اُنہیں تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی حقیقی مؤمن ہونے کی سند دے چکا ہے۔ اُن کے لیے استغفار کرنے کی ضرورت اِس وجہ سے ہے کہ اُن سے ایک کمزوری سرزد ہوگئی۔ اُنہوں نے اپنی کسی دُنیوی مصروفیت کو اتنا اہم

سمجھا کہ اُسے دین کے اجتماعی کام پر ترجیح دے دی۔ یہ اِس بات کی علامت ہے کہ ابھی اللہ تعالیٰ پر توکّل میں کمی ہے۔ ابھی وہ کیفیت نہیں ہے کہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا جائے۔

- اِس آیت میں سچے مؤمنوں کے لیے وہی اوصاف بیان ہوئے ہیں جو سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں ایمانِ حقیقی کی دو شرائط یا دو لوازم کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ یہ اوصاف ہیں: اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ہر شک و شبہ سے پاک ہوتے ہوئے ایمان لانا اور اللہ کی راہ میں مال اور جان کے ذریعے جہاد کرنا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

’’بے شک مؤمن تو وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر پھر اُنہوں نے شک نہیں کیا اور جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں۔ یہی لوگ سچے ہیں۔‘‘

ایمان کے دو لوازم میں سے پہلا سورۃ النور کی اِس آیت میں جوں کا توں موجود ہے‘ یعنی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا۔ دوسرا جزو وہاں مال و جان سے جہاد ہے جبکہ یہاں اجتماعیت کے لحاظ سے نظم کی پابندی ہے۔ جہاد ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ ایک منظّم اجتماعیت موجود نہ ہو۔ لہٰذا درحقیقت دونوں مقامات پر سچے مؤمنوں کے ایک ہی جیسے اوصاف کا ذکر ہے۔

- سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس آیت میں صرف ہمارے علم میں لانے کے لیے دورِ نبوی ﷺ میں مؤمنوں کے طرزِ عمل کو بیان کیا گیا ہے یا اِس میں ہمارے لیے بھی کوئی ہدایت کا عملی پہلو ہے؟ کیا یہ آیت ہمارے لیے ماضی کا کوئی واقعہ بیان کر رہی ہے یا ہمیں کوئی عملی ہدایت بھی دے رہی ہے؟ غور کیجیے تو یہاں ایک اہم عملی ہدایت دی جا رہی ہے۔ وہ ہدایت یہ ہے کہ ہم بھی اُس مشن کے لیے اجتماعی جدوجہد کریں جو مشن تھا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا۔ اِس مشن میں دو کام بڑے نمایاں تھے: دعوتِ دین اور اقامتِ دین۔ دعوتِ دین کا فریضہ مقصدِ امتِ مسلمہ ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ میں فرمایا گیا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾

''(مسلمانو!) تم بہترین امت ہو جسے بھیجا گیا ہے لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے' تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔''

اور اقامتِ دین کا فریضہ مقصدِ بعثت ہے رسول اللہ ﷺ کا:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹)

''وہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو بھیجا ہے کامل ہدایت (قرآن) دے کر اور ایک عدل کا نظام دے کر' تاکہ وہ اُسے کُل کے کُل نظامِ زندگی پر غالب کر دیں۔''

مؤمنانہ طرزِ عمل یہ ہے کہ ہم نصرتِ دین کے لیے قائم کی گئی اجتماعیت میں شامل ہو کر مال و جان سے دینِ حق کی تبلیغ اور غلبہ کے لیے جدوجہد کریں۔ نصرتِ دین کے مشن کو اپنے ذاتی معاملات پر ترجیح دیں اور جب بھی اِس مشن کے لیے پکارا جائے فوراً حاضر ہو جائیں۔ پھر اجتماعی کام کو بلا اجازت چھوڑ کر نہ جائیں۔

- نصرتِ دین کے لیے جو اجتماعیت قائم کی جائے گی وہ اُسی وقت اجتماعیت کہلائے گی جب اُس میں نظم کی پابندی ہو۔ اِس کے لیے ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح خود کو سمع و طاعت کا خوگر بنانا ہوگا۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا اور نظم کے معاملے میں بے پروا ہو گئے تو یہ طرزِ عمل گویا حقیقی مؤمن ہونے کی نفی ہے۔ ایسا طرزِ عمل منافقانہ ہے کہ جی میں آیا تو امیر کا حکم مان لیا اور جی میں نہیں آیا تو نہیں مانا۔ کسی اجتماع میں بلایا گیا ہے تو اگر طبیعت آمادہ ہوئی تو پہنچ گئے' اگر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی تو نہیں آئے۔ معمولی بہانوں کو آڑ بنا کر دین کے لیے وقت دینے سے گریز کرنا ثابت کرتا ہے کہ ایسا کرنے والے کے نزدیک دینی کام کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ایسا طرزِ عمل رکھنے والے لوگ کتنی ہی کثیر تعداد میں جمع ہو جائیں وہ کبھی بھی جماعت نہیں کہلائیں گے' بلکہ وہ ایک ہجوم کی صورت میں ہوں گے۔ علامہ اقبال نے اِسی کو اپنے ایک شعر میں واضح کیا ہے ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں

ہجوم (mob) تو بہت بڑا جمع ہو سکتا ہے لیکن دنیا میں کبھی بھی کوئی مثبت کام ہجوم سے نہیں ہوا۔ ہجوم تو صرف کوئی منفی اور تخریبی کام ہی کر سکتا ہے۔ مثبت اور تعمیری کام کرنے کے لیے ایک منظم جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس جماعت میں طے ہوتا ہے کہ کون امیر

ہے اور کون مامور۔ مامور معروف کے دائرے میں سمع و طاعت کا پابند ہوتا ہے' یعنی امیر کے حکم کی اطاعت کرتا ہے۔

- نصرتِ دین کے لیے قائم اجتماعیت میں مضبوط نظم پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ سورۃ النور کی اِس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی کون سی حیثیت مراد ہے! آپ ﷺ کی بالاتر اور عظیم ترین حیثیت تو یہ ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ باقی تمام حیثیتیں اِس کے تابع ہیں۔ البتہ اُس وقت آپ ﷺ کی حیثیت صحابہ کرامؓ کے لیے ریاست کے سربراہ' لشکر کے سپہ سالار اور اُن کی جماعت کے امیر کی بھی تھی۔ آج اگر ہم کسی اجتماعیت میں نظم پیدا کرنے کے لیے دورِ نبوی ﷺ سے رہنمائی لینا چاہتے ہیں تو ہمیں آپ ﷺ کی امیر جماعت کی حیثیت کو اُسوہ بنانا ہوگا۔ اجتماعیت کے امیر کے لیے اسوہ آپ ﷺ ہوں گے اور مامورین کے لیے نمونہ صحابہ کرامؓ۔ آج کے مامورین سچے مؤمن اُسی وقت کہلائیں گے جب وہ صحابہ کرامؓ کی طرح نصرتِ دین کے مشن کو مقدم رکھتے ہوئے اِس کے لیے مال و جان کی ہر ممکن قربانی پیش کریں۔ اِس کا مظہر یہ ہے کہ:

i) جب بھی کسی اجتماعی کام کے لیے بلایا جائے تو وہ اپنی ذاتی مصروفیات کو ترک کر کے حاضر ہو جائیں۔ اجتماعی کام سے مراد کوئی مشاورتی یا تربیتی اجتماع ہو سکتا ہے' کوئی دعوتی و تبلیغی مہم ہو سکتی ہے' کسی گروہ سے گفت و شنید کا سلسلہ ہو سکتا ہے یا باطل کے ساتھ تصادم کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔

ii) اگر وہ محسوس کریں کہ اب اجتماعی کام میں اُن کی ضرورت نہیں لہٰذا وہ اُسے چھوڑ کر واپس اپنے ذاتی کام کی طرف جانا چاہیں تو امیر سے باقاعدہ اِس کے لیے رخصت طلب کریں۔

iii) رخصت طلب کرنے کے بعد یہ نہ سمجھیں کہ امیر ضرور اُن کا عذر قبول کر کے اُن کی رخصت کی درخواست منظور کر لے گا۔ بلکہ امیر کے اِس اختیار کو تسلیم کریں کہ وہ چاہے تو اُنہیں رخصت دے اور چاہے تو نہ دے۔ ممکن ہے امیر اُن کے عذر کو قبول نہ کرے یا محسوس کرے کہ ابھی اگلے مراحل میں اِس ساتھی کی معاونت درکار ہوگی' یا ابھی ایک ایسی بات سامنے آنی ہے جو اِس ساتھی کی تربیت کے لیے ضروری ہے' یا وہ اپنی کسی پوشیدہ حکمت کے تحت ساتھی کو مزید روکنا چاہے۔ بہرحال اگر امیر رخصت نہ دے تو

مامور کو اُس کا فیصلہ دلی طور پر قبول کرنا چاہیے۔ دنیا کی کوئی مجبوری اور مشغولیت اجتماعی کام سے بڑھ کر اہم نہیں ہے۔ اگر ترجیحات اِس طرح نہ طے کی گئیں تو کام آگے نہیں چلے گا اور قدم قدم پر رکاوٹ پیش آئے گی۔

iv) مامورین کو سمجھ لینا چاہیے کہ دین کے کام سے عذر پیش کرنا اور رخصت طلب کرنا فی الاصل ایک کمزوری ہے۔ ابھی اُن کا توکل اللہ تعالیٰ پر اُس درجہ نہیں پہنچا کہ وہ اپنے معاملات اُس کے حوالے کر کے دین کے کام کے لیے یکسو ہو جائیں۔ غور کریں کیا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر نہیں ہے؟ کیا وہ اُن کے بغیر اُن کی ضرورت کو پورا نہیں فرما سکتا؟ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ)) (۱)

''جو شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اُس کے کسی کام میں لگا ہوا ہو تو اللہ اس کے کام کو پورا کرنے میں لگ جاتا ہے۔''

یہ تو انسانوں کا باہمی معاملہ ہے۔ آپ اپنے کسی بھائی کے کام میں لگے ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں لگ جاتا ہے اور اگر آپ اللہ تعالیٰ کے کام میں لگے ہوئے ہوں تو کیا وہ آپ کے کام میں نہیں لگے گا؟ بقول شاعر ؎

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

''ہمارا کارساز ہمارے کام کی فکر میں ہے۔ ہمارا اپنے کام کے بارے میں خود فکر کرنا ہمارے لیے باعث تکلیف بن جاتا ہے۔''

اپنے کسی کام کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینے کا یقینی طریقہ یہ ہے کہ آپ اُس کے کام میں لگ جائیں۔ اگر آپ اللہ تعالیٰ کی نصرت کر رہے ہیں تو وہ لازماً آپ کی نصرت کرے گا۔ کسی شریف اور بامروّت انسان سے بھی یہ بات بعید ہے کہ آپ اُس کے دست و بازو بنیں اور وہ آپ کو تنہا چھوڑ دے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیسے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا جبکہ آپ اُس کے دین کی نصرت کر رہے ہوں؟

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمہ۔ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم الظلم۔

سورۃ النور، آیت ۶۳

﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ﴾ ''نہ بنالو رسولؐ کے بلاوے کو آپس میں''..... ﴿كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ﴾ ''جیسے کہ بلاوا ہوتا ہے تم میں سے کسی کا کسی کے لیے''..... ﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ﴾ ''یقیناً اللہ جانتا ہے اُن لوگوں کو جو کھسک جاتے ہیں تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ لے کر''..... ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ﴾ ''پس چاہیے کہ ڈریں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں رسولؐ کے حکم کے''..... ﴿اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ﴾ ''کہ آجائے اُن پر کوئی فتنہ''..... ﴿اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۶۳﴾ ''یا آجائے اُن پر دردناک عذاب۔''

- اِس آیتِ مبارکہ میں ''دُعاءَ الرَّسُوْل'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جس کے تین معنی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو پکارنا، رسول اللہ ﷺ کا دعا کرنا اور رسول اللہ ﷺ کا کسی کو بلانا۔ اِن مختلف معنوں کے لحاظ سے آیتِ مبارکہ کے تین مفہوم ہو سکتے ہیں جن کی وضاحت ذیل میں کی جا رہی ہے۔
- آیتِ مبارکہ کا پہلا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی کام کے لیے پکارنا یا بلانا ہو تو ایسے نہ پکارو/بلاؤ جیسے تم ایک دوسرے کو بے تکلفی سے بلاتے ہو۔ اُن کو بلانا ہو تو اُن کے ادب، احترام اور عظمت کا پورا خیال رکھو۔ ''یا محمدؐ'' کہہ کر نہیں بلکہ ''یا نبی اللہ'' اور ''یا رسول اللہ'' جیسے تعظیمی القاب سے پکارو۔ اُن سے گفتگو کے دوران بھی اُن کی تعظیم و اکرام کو ملحوظ رکھو۔ اِس حوالے سے ذرا سی بے ادبی بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں پکڑ کا ذریعہ بن جائے گی۔

سورۃ الحجرات، آیات ۱ تا ۵ میں ارشاد ہوا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۳ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ بلند کرو اپنی آوازیں نبیؐ کی آواز پر اور نہ اونچی کرو آواز اُن کے ساتھ بات کرنے میں جیسا کہ اونچی کرنا ہوتا ہے آواز تم میں سے ایک کا دوسرے کے لیے' ایسا نہ ہو برباد ہو جائیں تمہارے اعمال اور تم خبر تک نہ رکھتے ہو۔ بے شک جو لوگ پست رکھتے ہیں اپنی آوزیں اللہ کے رسولؐ کے سامنے یہی لوگ ہیں کہ آزما لیے ہیں اللہ نے اُن کے دل تقویٰ کے لیے۔ اُن کے لیے بخشش ہے اور شاندار بدلہ۔ بے شک (اے نبی ﷺ!) جو لوگ پکارتے ہیں آپ کو حجروں کے باہر سے اُن کے اکثر نہیں سمجھتے۔ اور اگر یہ کہ وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ نکلتے اُن کی طرف یقیناً بہتر ہوتا اُن کے لیے' اور اللہ بہت بخشنے والا' ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔''

- آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کو کسی عام آدمی کی دعا کی طرح نہ سمجھو۔ وہ خوش ہو کر تمہیں دعا دیں تو تمہارے لیے اِس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ یہ دعا تمہاری دنیا اور آخرت سنوارنے کا ذریعہ بن جائے گی۔ اِس کے برعکس اگر وہ ناراض ہو کر بددعا دیں تو تمہاری اِس سے بڑھ کر کوئی بدنصیبی نہیں۔ یہ بددعا تمہیں شدید اور ابدی تباہی و بربادی سے دوچار کر دے گی۔ لہٰذا اُن کی اطاعت کر کے اُنہیں خوش رکھنے اور اُن کی دعائیں لینے کی کوشش کیا کرو۔
- آیت کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بلانے کو عام آدمیوں میں سے کسی کے بلانے کی طرح نہ سمجھو۔ اُن کے بلانے پر لبیک کہنا' حاضر ہونا' اُن کی بات سننا اور اُس پر عمل کرنا فرض ہے۔ اگر اُن کے بلانے پر دل میں ذرہ برابر بھی تنگی محسوس کی تو ایمان اور اعمال دونوں کے زائل ہونے کا خطرہ ہے۔
- آیتِ مبارکہ کے مذکورہ بالا تینوں مفہوم اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے صحیح ہیں' لیکن آیت کے سیاق وسباق سے تیسرا مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔
- آج اِس آیتِ مبارکہ میں ہمارے لیے یہ رہنمائی اور تعلیم ہے کہ ہم اپنے امراء' بزرگوں اور بڑوں کا ادب واحترام کریں۔ اُن کو نام لے کر نہ پکاریں بلکہ تعظیمی لقب سے مخاطب کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ ''با ادب بانصیب' بے ادب بے نصیب''۔ اگر ہم نے بڑوں کی دل سے تعظیم نہ کی تو کوئی خیر وخوبی حاصل نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا ہماری سعادت اِسی میں ہے کہ ہم اُنہیں ممکنہ حد تک خوش رکھ کر اُن کی دعائیں اور نیک تمنائیں حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہم یہ بات بھی سمجھ لیں کہ اسلامی نظم جماعت میں امیر کا طلب کرنا اپنے کسی

دوست' کسی بھائی یا کسی عزیز کے طلب کرنا جیسا نہیں ہے۔ امیر جماعت کا طلب کرنا دین کے حوالے سے ہے اور کسی اور کا بلانا دنیا کے حوالے سے۔ اگر ہم نے دین کو دنیا پر ترجیح دے رکھی ہے تو پھر امیرِ جماعت کے طلب کرنے پر نقشہ یہ ہونا چاہیے کہ ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحّتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

یہ اشعار تحریکی مزاج کے بہترین عکاس ہیں۔ یہ واضح کر رہے ہیں کہ کسی انقلابی جماعت میں شریک لوگوں کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے؟ جیسے ہی گھنٹی بجی اور اِس کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی' تو آواز تنہا واپس نہیں گئی' ہم اُس کے ساتھ ہی گئے۔ خیریتِ جاں' راحت تن' صحتِ داماں' اِن میں سے کوئی چیز بھی راستے میں رکاوٹ نہیں بنی۔

- اِس آیتِ مبارکہ میں دوسرا مضمون منافقانہ کردار کی مذمت کا ہے۔ دورِ نبوی ﷺ میں جب کسی اجتماعی کام کے لیے بلایا جاتا تو بعض اوقات منافقین اپنے نفاق کو چھپانے کے لیے شرما شرمی میں آجاتے' البتہ یہ حاضری اُنہیں سخت ناگوار ہوتی۔ اُنہیں ڈر ہوتا اور اُن کی جان پر بنی ہوتی کہ کہیں مال اور جان لگانے کا کوئی تقاضا نہ سامنے آجائے۔ لہٰذا وہ حاضری لگانے کے بعد کسی نہ کسی طرح بلا اجازت موقع پا کر' آنکھ بچا کر یا اجازت لے کر جانے والے کسی مؤمن کی آڑ لے کر کھسک جاتے۔ سورۃ الحج آیت ۱۱ میں اِس کردار کو یوں بے نقاب کیا گیا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪﴾

''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارے پر رہ کر۔ پھر اگر اُسے پہنچے کوئی بھلائی تو بڑا مطمئن ہوتا ہے۔ اور اگر پہنچے اُسے کوئی آزمائش تو اُلٹا پھر جاتا ہے اپنے چہرے کے بل۔ وہ خسارے میں رہا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ وہی ہے بالکل واضح خسارہ۔''

سورۃ التوبہ‘ آیت ۱۲۷ میں منافقین کا چپکے سے کھسکنے کا طرزِ عمل یوں بیان کیا گیا:

﴿وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾﴾

’’اور جب کوئی سورۃ نازل ہوتی ہے‘ دیکھنے لگتے ہیں وہ ایک دوسرے کی طرف‘ (کہتے ہیں) کیا دیکھ تو نہیں رہا تمہیں کوئی‘ پھر چپکے سے چل دیتے ہیں۔ پھیر دیے ہیں اللہ نے اُن کے دل کیونکہ یہ لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔‘‘

سورۃ النور کی زیرِ درس آیت ۶۳ میں منافقین کو بڑے تاکیدی اسلوب میں خبردار کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اجتماعی کام سے چھپ چھپا کر بھاگ نکلنے والوں کو۔ لہٰذا وہ غور تو کریں کہ کسے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

- یہ آیت منافقین کو تنبیہ بھی کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بلانے کو ناگوار محسوس کرنا اور اجتماعی کام سے بلا اجازت کھسکنے کی کوشش کرنا دراصل آپ ﷺ کے احکامات کی مخالفت کے دائرہ میں آتا ہے۔ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے احکامات کی مخالفت کرتے ہیں وہ ڈریں اِس بات سے کہ کہیں کسی فتنے یا دنیا کی کسی سخت آفت یا آخرت کے دردناک عذاب میں نہ مبتلا ہو جائیں۔
- فتنہ کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ انفرادی اعتبار سے یہ کہ نفاق کسی دل میں جڑ پکڑ جائے اور اُسے اپنی بری حرکتیں بھی اچھی نظر آنے لگیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اجتماعی کام سے جی چرانے والوں کو کسی بیماری یا کسی مشکل میں ایسا پھنسا دے کہ اب وہ دینی کام کرنے کی سعادت ہی سے محروم ہو جائے۔ اِسی لیے ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ، وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ))(۱)

’’پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو۔ جوانی کو بڑھاپے سے پہلے‘ صحت کو بیماری سے پہلے‘ خوش حالی کو تنگ دستی سے پہلے‘ فراغت کو مشغولیت سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے۔‘‘

اجتماعی اعتبار سے فتنہ یہ ہے کہ نظم کی پابندی سے گریز مسلمانوں میں داخلی انتشار پیدا

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان‘ ح:۴۹۸‘ راوی: عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ۔

کر کے باہم تفرقہ اور خانہ جنگی کی صورت پیدا کر دے۔ پھر اُن کی اجتماعی قوت کمزور ہو جائے اور اُن پر کوئی ظالم و جابر حکمران مسلّط ہو جائے۔

سورۃ النور‘ آیت ۶۴

﴿اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ’’سن لو! بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے‘‘..... ﴿قَدْ يَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ﴾ ’’وہ خوب جانتا ہے جس حال پر تم ہو‘‘..... ﴿وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ﴾ ’’اور جس روز وہ لوٹائے جائیں گے اللہ کی طرف‘‘..... ﴿فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ﴾ ’’تو وہ بتا دے گا اُنہیں جو کچھ اُنہوں نے کیا‘‘..... ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾﴾ ..... ’’اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔‘‘

- یہ آیتِ مبارکہ آگاہ کر رہی ہے کہ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی ہے اور وہ ہر قت اُس کے دستِ قدرت میں ہے۔ کوئی چیز اُس کے اختیار سے آزاد نہیں۔ اب جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرتے ہوئے چپکے سے اجتماعی کام سے فرار اختیار کرتے ہیں کیا وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے محفوظ ہیں؟ وہ غور تو کریں کہ اتنی وسیع کائنات میں اُن کی حیثیت اور اوقات کیا ہے؟ اُن کے لیے بہتر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کو تسلیم کر کے اُس کے آگے سر جھکا دیں۔ اِس سے بھی اگلا درجہ یہ ہے کہ خود کو اللہ کے دین کے لیے وقف کر کے اپنے معاملات اللہ کے حوالے کر دیں۔ اِس پوری کائنات کا کارساز اُن کی بگڑیاں بنا دے گا‘ اُن کی مشکلات آسان کر دے گا اور اُن کے تمام امور کی بھلائی کے ساتھ عمدہ تکمیل فرما دے گا۔
- اِس آیت میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کے بیان کے بعد ہمیں خبردار کیا گیا کہ وہ جانتا ہے کہ ہم کس حال پر ہیں۔ اِس بات کا تعلق پوری سورۂ مبارکہ کے مضامین سے ہے۔ اِس سورۂ مبارکہ میں پردے کے احکامات بیان ہوئے‘ مؤمنانہ اور کافرانہ کردار واضح کیا گیا اور آخر میں نظم جماعت کی پابندی کے حوالے سے درست رویہ کی رہنمائی دی گئی۔ اب آخری آیت میں ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب باخبر ہے اِس سے کہ تم پردہ کے احکامات کا پاس کرنے والے ہو یا اُن سے گریز کرنے والے ہو‘ کردار کے اعتبار سے مومن ہو یا منافق اور نظمِ جماعت کی پابندی کرنے والے ہو یا اُس کی خلاف ورزی کرنے والے۔ گویا تم جتنے پانی میں بھی ہو‘ وہ اللہ تعالیٰ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔

- آیتِ مبارکہ کے آخر میں ارشاد ہوا کہ عنقریب روزِ قیامت سب لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُنہیں اُن کے دنیوی طرزِ عمل کی حقیقت سے آگاہ فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اِس دنیا میں اپنی رضا کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور روزِ قیامت کی رسوائی سے محفوظ فرمائے۔ آمین!
- سورۃ النور کی اِن آیات (۶۲ تا ۶۴) کو پڑھتے ہوئے محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں دین کی نصرت کے لیے اجتماعی سرگرمیوں کا کیا مقام ہے اور اُس کے نزدیک اِس حوالے سے نظم کی پابندی کی کیا اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کس قدر شد و مد سے اُن امور پر زور دے رہا ہے جو دین کی نصرت کے کام کو سنجیدگی اور منظم انداز سے انجام دینے کے لیے ضروری ہیں۔
- آج لوگوں کی بڑی تعداد اسلام کے صرف انفرادی زندگی کے حوالے سے احکامات پر عمل کر رہی ہے۔ وہ لوگ دین کی تبلیغ یا اقامت کے لیے کسی اجتماعی جدوجہد میں شریک نہیں ہیں۔ وہ غور کریں کہ کیا وہ اِن آیات میں اپنے لیے ہدایت کا کوئی پہلو پاتے ہیں؟ بلاشبہ قرآنِ حکیم سے ہدایت تو ایسے ہی لوگوں کو ملے گی جو نصرت و اقامتِ دین کے اُس مشن کے لیے اجتماعی جدوجہد کر رہے ہوں جس مشن میں قدم پر قدم پر رہنمائی کے لیے قرآنِ حکیم آہستہ آہستہ اور موقع بہ موقع ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا۔

سورۃ التوبہ' آیات ۴۳ تا ۴۹

- سورۃ التوبہ' آیات ۴۳ تا ۴۹ کے پس منظر میں غزوۂ تبوک کے موقع پر سامنے آنے والا مؤمنانہ اور منافقانہ طرزِ عمل ہے۔ یہ غزوہ مندرجہ ذیل اسباب کی وجہ سے دورِ نبوی ﷺ کا مشکل ترین معرکہ تھا:

(i) اُس وقت دنیا میں دو بادشاہتوں کو بڑی طاقتیں تسلیم کیا جاتا تھا' یعنی سلطنتِ ایران اور سلطنتِ روما۔ گویا غزوہ تبوک میں وقت کی ایک بڑی طاقت سلطنتِ روما کے ساتھ مسلمانوں کا ٹکراؤ تھا۔

(ii) موسم گرمیوں کا تھا اور گرمی بھی پوری شدت پر تھی۔

(iii) سفر انتہائی طویل تھا۔ تبوک کا فاصلہ مدینہ سے تقریباً سات سو کلومیٹر ہے۔

(iv) خوراک کی کمی کا یہ عالم تھا کہ دو ساتھیوں کو روزانہ ایک کھجور پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔

(v) سواریوں کی کمی تھی اور اٹھارہ ساتھیوں کو باری باری ایک اونٹ پر سفر کرنا پڑتا تھا۔

(vi) مدینہ میں کھجور کی فصل تیار ہونے کے قریب تھی۔ اگر فصل کو بروقت اتارا نہ جائے تو وہ درخت کے اوپر ہی ضائع ہو جاتی ہے۔ اب جبکہ مرد سفر پر جا رہے تھے تو خواتین کے لیے پیچھے ممکن نہ تھا کہ وہ کھجور کی فصل اتار سکیں۔ اِس فصل کے ضائع ہونے کی صورت میں آئندہ کے لیے بھی خوراک کی قلت کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

مذکورہ بالا مشکلات کی وجہ سے غزوۂ تبوک کو ''جیش العسرۃ'' کہا جاتا ہے۔ دورِ نبوی ﷺ میں یہ واحد موقع تھا کہ اِس میں نفیرِ عام کا حکم دیا گیا۔ ہر مسلمان سے کہا گیا کہ وہ اللہ کی راہ میں نکلے اور جو بھی مال اِس راہ میں دے سکتا ہے' پیش کرے۔ اگر کوئی عذر لاحق ہے تو رخصت کی اجازت حاصل کرے۔

- سفرِ تبوک کے انتہائی مشکل موقع پر نفیرِ عام کے حکم اور مال و اسباب کے لیے عطیہ کی اپیل نے آزمائش کی ایسی صورت پیدا کر دی کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا ہو گیا۔ مؤمنانہ اور منافقانہ کردار بالکل واضح ہو گیا۔ مؤمنین مال و جان کی قربانیاں دینے کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگے جبکہ منافقین کی جان پر بن آئی۔ اُن میں سے کچھ نے جھوٹے بہانے بنا کر اور جھوٹی قسمیں کھا کر سفر سے پہلے ہی رخصت حاصل کر لی۔ کچھ نے اِس ناپاک امید پر رخصت نہ لی کہ اب مسلمان واپس نہ آ سکیں گے کیونکہ وقت کی ایک بڑی طاقت سے لڑنے جا رہے ہیں۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سرخرو کر کے واپس کر دیا تو پھر آ کر معذرتیں کرنے لگے۔ سورۃ التوبہ کی آیات ۴۳ تا ۴۹ میں ایسے منافقین کی مذمت کی گئی ہے جنہوں نے سفرِ تبوک کے لیے روانگی سے پہلے ہی جھوٹے عذر تراش کر رخصت لے لی تھی۔

- سورۃ النور کی آیت ۶۲ اور سورۃ التوبہ کی آیات ۴۳ تا ۴۵ میں بظاہر دو تضادات محسوس ہو رہے ہیں:

(i) سورۃ النور کی کے آیت ۶۲ میں نبی اکرم ﷺ کو اختیار دیا جا رہا ہے کہ آپ رخصت کی اجازت طلب کرنے والوں میں سے جسے چاہیں رخصت دے دیں اور جسے چاہیں نہ دیں۔ اِس کے برعکس سورۃ التوبہ کی آیت ۴۳ میں آپ ﷺ سے پوچھا جا رہا کہ

آپ ﷺ نے منافقین کو رخصت کی اجازت کیوں دی؟

(ii) سورۃ النور کی آیت ۶۲ میں یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی کہ ایمان رکھنے والے تو وہی ہیں جو اجتماعی کام سے رخصت حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ اجازت طلب کرتے ہیں‘ جبکہ سورۃ التوبہ کی آیت ۴۴ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ایمان رکھنے والے تو رخصت کی اجازت مانگتے ہی نہیں۔ پھر آیت ۴۵ میں آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اجتماعی کام سے رخصت کی اجازت وہی لوگ طلب کر رہے ہیں جو ایمان کی دولت سے محروم ہیں۔

- اگر ایک بنیادی فرق کو سمجھ لیا جائے تو بظاہر محسوس ہونے والے مذکورہ تضادات رفع ہو جائیں گے۔ سورۃ النور کی آیت ۶۲ ایک ایسی صورتِ حال سے بحث کر رہی ہے جس میں نفیرِ عام یعنی اجتماعی کام کے لیے نکلنے کا لازمی تقاضا نہیں ہے۔ اِس کے برعکس سورۃ التوبہ کی آیات ۴۳ تا ۴۵ ایک ایسے پس منظر میں نازل ہوئیں جس میں اجتماعی کام کے لیے نکلنے کے لیے نفیرِ عام ہے۔ جب نفیرِ عام نہ ہو تو عذر کا پیش کیا جانا کچھ اور معنی رکھتا ہے اور جب شدت کے ساتھ حکم دیا گیا ہو کہ ہر ایک کو نکلنا ہے تو ایسے نازک موقع پر عذر پیش کرنا کوئی اور معنی رکھے گا۔ اب جو اِس موقع پر نکلنے سے جی چرائے گا اور رخصت کی درخواست پیش کرے گا وہ واقعی ایمان کی حقیقت سے محروم ہے اور اُسے رخصت دینے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کو متوجہ کرنا اِسی پس منظر میں ہے۔
- غزوۂ تبوک کے پس منظر سے قطع نظر عام حالات میں بھی بظاہر محسوس ہونے والے تضاد کو مختلف کیفیات کے موازنہ سے رفع کیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ اجتماعی معاملات میں شریک ہی نہیں ہوتے‘ یا وہاں سے بغیر عذر پیش کیے یا رخصت طلب کیے خاموشی سے کھسک جاتے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں عذر پیش کرنے والے اور رخصت طلب کرنے والے صاحب ایمان قرار پائیں گے۔ البتہ اِن کے مقابلے میں وہ لوگ ایمان کی بلند منزل پر ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے مُسبب الاسباب ہونے پر ایسا گہرا یقین حاصل ہے اور اُنہیں اطمینان ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی ضروریات کو زیادہ بہتر جانتا ہے اور اُن کے مسئلے کو بہتر طور سے حل کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اپنا معاملہ اُس کے سپرد کرتے ہیں اور رخصت حاصل کرنے کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ گویا یہاں ایمان کا اثبات درحقیقت relative کیفیات پر ہے۔

سورۃ التوبہ‘ آیت ۴۳

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) درگزر فرمایا اللہ نے آپ سے‘‘..... ﴿لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ ’’کیوں اجازت دی آپؐ نے اُنہیں‘‘ .....﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا﴾ ’’یہاں تک کہ ظاہر ہو جاتے آپؐ پر وہ لوگ جنہوں نے سچ کہا‘‘ ..... ﴿وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۴۳﴾ ’’اور آپ جان لیتے جھوٹوں کو۔‘‘

- سفرِ تبوک پر روانگی سے قبل جب بعض منافقین نے بناوٹی عذرات پیش کر کے نبی اکرم ﷺ سے رخصت مانگی تو آپ ﷺ نے اُنہیں رخصت کی اجازت دے دی۔ اِس کی دو وجوہات ممکن ہیں:

(i) آپ ﷺ کی نرم مزاجی‘ تحمل اور مروّت کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ کبھی کسی جھوٹے کو اُس کے مُنہ پر جھوٹا کہہ کر شرمندہ نہیں کرتے تھے۔ اپنی اعلیٰ فراست کی بنیاد پر جان لیتے تھے کہ کون جھوٹ بول کر محض ایک بناوٹی عذر تراش رہا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

((اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ)) (۱)

’’مؤمن کی فراست سے ڈرو‘ اس لیے کہ وہ تو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔‘‘

جب عام مؤمن کی فراست اور معاملہ فہمی کی یہ کیفیت ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی فراست کا عالم کیا ہوگا۔ لہٰذا یہ جاننے کے باوجود کہ منافقین کے بہانے جھوٹے ہیں‘ آپ ﷺ نے اُنہیں رخصت عطا فرما دی۔

(ii) نظم کو سمجھ داری کے ساتھ چلانے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جنہیں ایک فہم و فراست والا امیر سمجھتا ہے۔ وہ اپنی مردم شناسی کی بنیاد پر جانتا ہے کہ کون سا مامور میری بات مانے گا اور کون نہیں مانے گا۔ آپ ﷺ سے بڑھ کر فہیم اور مردم شناس کون ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ جانتے تھے کہ کون سا مامور ایسا نافرمان ہے کہ جو میری طرف سے اُس کا عذر قبول نہ کرنے کے باوجود اللہ کی راہ میں نہیں نکلے گا اور اِس روش سے نظم میں بگاڑ پیدا کرے گا۔ یا نکل بھی گیا تو عذر قبول نہ ہونے کی جلن کا شکار ہو کر جماعت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا ایسے شخص کو جھوٹا عذر پیش کرنے پر

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب تفسیر القرآن‘ باب ومن سورۃ الحجر۔

آپ ﷺ رخصت کی اجازت تو دے دیتے تھے لیکن درحقیقت اِس کا مطلب ہوتا تھا کہ جاؤ دفع ہو جاؤ اور حزب اللہ کے نظم کو خراب نہ کرو۔

- منافقین کو رخصت کی اجازت دینے پر اللہ تعالیٰ نے نہایت لطیف انداز میں اور بڑی محبت کے ساتھ درگزر کرنے کی بشارت دیتے ہوئے آپ ﷺ کو متوجہ فرمایا کہ اِن بدبختوں کو اجازت کیوں دی گئی؟ اللہ تعالیٰ تو چاہتا تھا کہ اُنہیں اجازت نہ دی جاتی' وہ اجازت نہ ملنے کے باوجود اللہ کی راہ میں نہ نکلتے اور یوں اُن کے نفاق کی حقیقت ظاہر ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ کی تو یہ سنت ہے کہ وہ آزمائشوں کے ذریعے کھرے اور کھوٹے کو علیحدہ کر کے ہر ایک کی حقیقت ظاہر فرما دیتا ہے۔ ارشاداتِ باری تعالیٰ ہیں:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ﴾ (آلِ عمران: ۱۷۹)

''نہیں ہے اللہ کہ چھوڑ دے مؤمنوں کو اِسی حال پر تم ہو جس پر یہاں تک کہ وہ جدا کر دے گا ناپاک لوگوں کو پاک لوگوں سے۔''

﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳﴾ (العنکبوت)

''پھر اللہ ظاہر کر کے رہے گا اُن کو جو سچے ثابت ہوئے اور وہ ظاہر کر کے رہے گا جھوٹوں کو۔''

﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱﴾ (العنکبوت)

''اور اللہ ظاہر کر کے رہے گا اُن کو جو ایمان لائے اور وہ ظاہر کر کے رہے گا منافقوں کو۔''

جب منافقین کا عذر قبول کر لیا گیا تو آزمائش ختم ہو گئی اور اُن کے نفاق پر پردہ پڑا رہ گیا۔ اگر اُنہیں رخصت نہ دی جاتی اور پھر وہ گھر بیٹھے رہتے تو واضح ہو جاتا کہ اُن کے اندر سرکشی ہے اور اُن کی نافرمانی سے اُن کا منافقانہ کردار بے نقاب ہو جاتا۔

سورۃ التوبہ' آیت ۴۴

﴿لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''نہیں اجازت مانگتے آپؐ سے وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور آخرت کے دن پر''..... ﴿اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ﴾ ''اِس سے کہ وہ جہاد کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے''..... ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝۴۴﴾ ''اور اللہ خوب جاننے والا ہے پرہیزگاروں کو۔''

- یہ آیت آگاہ کر رہی ہے کہ حقیقی مؤمن اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال و جان لگانے سے کبھی نہیں کتراتے۔ مال و جان کے ساتھ سعادت والی اِس راہ میں جہاد کرنا تو ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ حقیقت سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ بے شک مؤمن تو وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر پھر اُنہوں نے شک نہیں کیا اور جہاد کیا اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں۔ کیسے ممکن ہے کہ کسی کے باطن میں اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان موجود ہو اور وہ آ کر اللہ کے رسول ﷺ سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے حوالے سے رخصت طلب کرے؟
- جو انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اُسے یہ حقیقت ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کی ہر بات کو جانتا ہے اور اُس کی ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے سے بچے گا اور کبھی بھی اللہ کے دین کی خدمت کو پس پشت ڈالنے اور اِس کے لیے مال اور جان لگانے سے گریز کرنے کا جرم نہیں کرے گا۔
- آخرت پر ایمان کے حوالے سے غور کیجئے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا کام اور دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت کیا آخرت کے عذاب سے زیادہ بڑی ہو سکتی ہے؟ آخرت کے عذاب سے نجات کے لیے اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبہ کے لیے جہاد کرنا لازمی شرط ہے۔ سورۃ الصّف کی آیات ۱۰ اور ۱۱ میں ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! کیا میں رہنمائی کروں تمہاری ایسی تجارت کی طرف جو بچا لے تمہیں دردناک عذاب سے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانتے ہو۔''

گویا آخرت میں دردناک عذاب سے بچنے کے لیے حقیقی ایمان لانا اور اللہ کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرنا ضروری ہے۔ اب جو انسان اللہ کے دین کے لیے جہاد سے فرار اختیار کرتا ہے یا اُس کے مقابلہ میں دنیا کے کسی معاملہ کو مقدم کرتا ہے تو وہ آخرت کے دردناک عذاب کو دعوت دیتا ہے۔ جسے آخرت پر واقعتاً ایمان حاصل ہے اُس کی کوشش

تو یہ ہوگی کہ میرا دنیا میں کوئی نقصان ہونا ہے تو ہو جائے لیکن آخرت میں مجھے کسی خسارے یا رسوائی کا سامنا نہ ہو۔

- آیت کے آخر میں خوشخبری دی گئی کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے اُس کے دین کی نصرت اور خدمت میں سرگرداں اور سرگرم ہیں وہ واقعی متقی ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے خوب واقف ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اُنہیں اُن کی محنتوں کا بھرپور بدلہ عطا فرمائے گا۔

سورۃ التوبہ' آیت ۴۵

﴿اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''صرف وہی اجازت مانگتے ہیں آپؐ سے جو نہیں ایمان رکھتے اللہ پر اور آخرت کے دن پر'' ..... ﴿وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ''اور شک میں پڑے ہوئے ہیں اُن کے دل'' ..... ﴿فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ ۝۴۵﴾ ''سو وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں۔''

یہ آیتِ مبارکہ خبردار کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلنے سے رخصت وہی لوگ طلب کرتے ہیں جو حقیقت میں اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اُن کے دل نورِ ایمان سے محروم ہیں۔ نفاق کی بیماری نے اُن کے دلوں میں شکوک و شبہات کے ایسے کانٹے پیدا کر دیے ہیں کہ اب وہ گومگو کا شکار ہیں۔ فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ آگے بڑھیں یا نہ بڑھیں! چلیں یا نہ چلیں! اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ ..... اے اللہ! پاک فرما دے ہمارے دلوں کو نفاق سے۔ آمین!

سورۃ التوبہ' آیت ۴۶

﴿وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً﴾ ''اور اگر منافقین ارادہ کرتے نکلنے کا تو ضرور تیار کرتے اُس کے لیے کچھ سامان'' ..... ﴿وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ﴾ ''لیکن ناپسند کیا اللہ نے اُن کا اٹھنا'' ..... ﴿فَثَبَّطَهُمْ﴾ ''پھر روک دیا اُنہیں'' ..... ﴿وَقِیْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ ۝۴۶﴾ ''اور کہہ دیا گیا بیٹھے رہو' بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ۔''

- یہ آیت سفرِ تبوک کے لیے منافقین کے نہ نکلنے پر مسلمانوں کو تسلی دے رہی ہے۔ ارشاد ہوا کہ اُن کا طرزِ عمل بتا رہا ہے کہ اُن کی نیت خراب تھی' اُنہوں نے نکلنا تھا ہی نہیں۔ اگر اُن کا نکلنے کا ارادہ ہوتا تو اُس کے لیے تیاری کرتے۔ اُن کا اصل ارادہ تو اِس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اُنہوں نے نکلنے کے لیے کوئی اہتمام سرے سے کیا ہی نہیں۔ اپنے مسائل کے حل کے

لیے پہلے سے کوئی بھاگ دوڑ کی ہی نہیں۔ عین وقت پر آ کر کہہ دیا کہ میری یہ مجبوری اور میرے یہ مسائل ہیں۔ نہ نکلنے کے لیے اُن کے عذر جھوٹے ہیں اور بطورِ سزا اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنی راہ میں نکلنے کی سعادت سے محروم کر دیا ہے۔

- یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ اِس کائنات کے ہر ہر عمل میں ایک ایسی ہستی کا ارادہ کارفرما ہے جو سمیع اور بصیر ہے' حی اور قیوم ہے' علیم اور خبیر ہے۔ کسی فرد کو نیک کام کی توفیق بھی اُسی ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ اِس کے لیے اُس کا طے کردہ ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص نیک کام کا ارادہ کرتا ہے اور اُس کے لیے اپنی سی کوشش کرتا ہے تو پھر اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس نیک کام کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے۔ جس کا نیکی کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے زبردستی نیکی کرنے کی توفیق نہیں دیتا۔ اگر وہ کسی کو زبردستی نیکی کی توفیق دے دیا کرے تو اِس میں نیکی کرنے والے کا کوئی کمال نہیں رہے گا اور نہ ہی نیکی نہ کرنے والے قصوروار قرار پائیں گے۔ یہ دنیا تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کا امتحان لینے کے لیے بنائی ہے۔ لہٰذا جو خود خلوص سے نیکی کا ارادہ کرے گا' اللہ تعالیٰ اُس کے لیے نیکی کرنا آسان فرما دے گا اور جو نیکی کے ارادہ سے گریز کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے نیکی کرنے سے محروم کر دے گا۔ منافقین نے اللہ کی راہ میں نکلنے کی تیاری ہی نہیں کی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن کا اپنی راہ میں نکلنا پسند نہیں کیا۔ اُنہیں زمین میں گاڑ دیا' اُن کے پاؤں منوں کے ہو گئے اور وہ نکل ہی نہیں پائے۔ گویا اگر کسی کو نیکی کی توفیق نہیں ملی تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ اُسے اِس کی توفیق نہ ملے۔

- اِس آیت سے ایک ایسا اہم اصول حاصل ہوتا ہے جس سے معقول اور نامعقول عذر میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ عذر ایسے لوگوں کا قابلِ قبول ہو سکتا ہے جو حکم پر عمل کے لیے تیار ہوں اور پھر کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے معذور ہو گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ ایسے لوگوں کو حکم پر عمل کا اجر عطا کیا جائے گا۔ اِس کے برعکس جس نے حکم پر عمل کے لیے کوئی تیاری ہی نہیں کی اور پھر کوئی عذر بھی پیش آ گیا تو یہ ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ'' کی ایک مثال ہوگی۔ ایسا عذر محض بہانہ قرار پائے گا اور قابلِ قبول نہ ہوگا۔

سورۃ التوبہ' آیات ۴۷ تا ۴۸

﴿لَوْ خَرَجُوْا فِیْكُمْ﴾ ''اگر وہ نکلتے تم میں شامل ہو کر'' ..... ﴿مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا

خَبَالًا﴾ ''تو نہ اضافہ کرتے تم میں مگر خرابی کا''.....﴿وَّلَا اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ﴾ ''اور بھاگ دوڑ کرتے تمہارے درمیان فتنے اٹھانے کے لیے''..... ﴿وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ﴾ ''اور تم میں کچھ کان لگا کر سننے والے ہیں اُن کی باتوں کو''..... ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۴۷﴾ ''اور اللہ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو۔ ﴿لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''یقیناً اُنہوں نے چاہا ہے فتنہ اٹھانا اِس سے پہلے بھی''.....﴿وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ﴾ ''اور تلپٹ کیے ہیں (اے نبی ﷺ!) آپؐ کے لیے معاملات''.....﴿حَتّٰى جَاۗءَ الْحَقُّ﴾ ''یہاں تک کہ آ گیا حق''.....﴿وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ﴾ ''اور غالب ہو گیا اللہ کا حکم''.....﴿وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۴۸﴾ ''حالانکہ وہ ناپسند کرنے والے تھے۔''

- آیت ۴۷ میں مسلمانوں کو اُس حکمت سے آگاہ کیا گیا جس کی وجہ سے منافقین کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلنے سے روک دیا گیا۔ منافقین کی یہ روش تھی کہ اگر کبھی سچے مؤمنوں کے ساتھ کسی اجتماعی کام میں شریک بھی ہو جاتے تو دورِ جاہلیت کی عصبیتوں کو بیان کر کے اور باہم غلط فہمیاں پیدا کر کے جھگڑا و فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی پر عبداللہ بن اُبی نے انصارِ مدینہ کو مہاجرین کے خلاف اُکسانے کی مذموم کوشش کی تھی۔ فتحِ مکہ تک منافقین نے اسلامی تحریک کو ناکام کرنے کی پوری کوشش کی' لیکن جب مکہ فتح ہوا اور دین غالب ہو گیا تو اُن کے حوصلے پست ہو گئے۔ مسلمانوں کو تسلی دی گئی کہ اگر منافقین اِس سفرِ تبوک میں ساتھ ہوتے تو اپنی روش سے باز نہ آتے۔ وہ فتنے پیدا کرنے کے لیے تمہاری صفوں کے مابین گھوڑے دوڑاتے۔ کہیں سے کوئی بات لے کر اُسے منفی رنگ دے کر دوسری جگہ پہنچاتے اور انتشار اور باہم پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے۔ کہیں اوس اور خزرج کے درمیان پرانی عصبیتوں کی چنگاریاں بھڑکا کر اُنہیں آپس میں لڑانے کی کوشش کرتے۔ دشمن کے اسباب کی کثرت کا بڑھا چڑھا کر ذکر کر کے تم میں بزدلی اور بددلی پیدا کرتے۔ گویا بہت اچھا ہوا کہ تمہاری جمعیت جو نکلی وہ خالص جمعیت تھی اور وہ فتنہ اُٹھانے والے عناصر سے پاک رہی۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں گھروں میں روک کر تمہیں اُن کی شرارتوں سے محفوظ کر دیا۔
- یہ حقیقت ہے کہ بے دلی سے کام کرنے والوں سے کوئی خیر وجود میں نہیں آتا۔ وہ کام بنانے کے بجائے بگاڑتے ہیں۔ وہ بدگمانیاں پیدا کر کے اور طرح طرح کے شوشے چھوڑ کر جماعت میں انتشار پیدا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا جماعت میں ہونا تو درحقیقت

ایک بالقوہ کمزوری (potential weakness) ہے۔ گویا جماعت میں تعداد کا زیادہ ہونا ہر حال میں مفید نہیں ہوتا۔ اِسی لیے اللہ تعالیٰ تھڑدلے' خام ارادے رکھنے والے اور دنیا پرست لوگوں کو جماعت میں شمولیت سے محروم کر دیتا ہے۔

- مذکورہ بالا حقیقت سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ امیرِ جماعت کو پیچھے رہ جانے والے ساتھیوں کے طرزِ عمل پر زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تمام ساتھیوں کو فعال کرنے کے لیے اپنی سی پوری کوشش کرے' لیکن یہ بات سامنے رکھے کہ شاید کسی ساتھی کے پیچھے رہ جانے ہی میں بھلائی ہو۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ تبوک میں مسلمان بیس دن قیام پذیر رہے۔ اِس دوران صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو صبح و شام نبی اکرم ﷺ کی مبارک صحبت سے فیض یاب ہونے کی خوب سعادت حاصل ہوئی۔ وہاں پر کبھی ذکر ہو جاتا کہ فلاں ساتھی کیوں نہیں آئے؟ تو آپ ﷺ اِس تذکرے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ ﷺ فرماتے کہ چھوڑو اُس کے ذکر کو۔ اگر اُس میں کوئی خیر ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے تمہارے ساتھ ملا دے گا اور اگر اُس میں شر ہے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اُس کے شر سے بچا لیا اور اِسی میں بہتری ہے۔ گویا غیر فعال ساتھی کے بارے میں یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ لازماً باعثِ شر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی واقعی مجبوری نے اُسے غیر فعال کر دیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ خیر اور حسن ظن کے پہلو کو سامنے رکھا جائے' البتہ خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا نہ ہوا جائے۔ اگر کوئی خیر کا معاملہ ہے تو وہ ظاہر ہو جائے گا' اگر کوئی کوتاہی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے تلافی کی صورت پیدا فرما دے گا اور اگر معاملہ شر کا ہے تو پھر شر کا تو دور رہنا ہی بہتر ہے۔
- آیتِ مبارکہ کے آخر میں آگاہ کیا گیا کہ اے مسلمانو! تمہاری صفوں میں کچھ ایسے کمزور ایمان والے موجود ہیں جو اُن منافقین کی باتیں بڑے دھیان سے' کان لگا کر اور دلی آمادگی سے سنتے ہیں۔ گویا وہ منافقین کو اہمیت اور اُن کی باتوں کو وزن دیتے ہیں۔ آیت کے اِس آخری حصہ کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں جو منافقین کے لیے سنتے ہیں۔ یہ لوگ تمہاری باتیں خوب کان لگا کر سنتے ہیں کہ کوئی خبر رہ نہ جائے۔ پھر فتنے کی آگ بھڑکانے کے لیے یہ باتیں اُن منافقین تک پہنچاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں جاسوسی کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خبردار کر دیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ اللہ اُن کے احوال سے

خوب واقف ہے۔ اگر باز نہ آئے تو اپنے اِس طرزِ عمل کی عبرتناک سزا پائیں گے۔

- آیت ۴۸ میں نبی اکرم ﷺ اور مخلص مسلمانوں کو منافقین کی اللہ کی راہ میں نکلنے سے گریز کی روش پر تشویش میں مبتلا ہونے سے روکنے کا ایک اور پہلو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ منافقین کا کردار ماضی میں بھی سازشی اور تخریبی ہی رہا ہے۔ اُنہوں نے بہت سے مواقع پر فتنوں کی آگ بھڑکائی اور نبی اکرم ﷺ کے لیے معاملات کو تلپٹ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اسلام کے خلاف کبھی یہودیوں سے ساز باز کی' کبھی انصار و مہاجرین میں پھوٹ ڈال کر مہاجرین کو مدینہ سے نکالنے کی کوشش کی اور کبھی نبی ﷺ اور اُن کے گھر والوں پر بہتان لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی ہر سازش کو ناکام کیا اور فتح مکہ کے ذریعے سرزمین عرب میں اسلام کو غالب کر دیا۔ یہ اسلام کے اِس غلبہ پر جلن کے مارے پہلے ہی صدمہ سے دوچار ہیں۔ اب جبکہ غزوۂ تبوک کے ذریعے بیرونِ عرب دینِ حق کے غلبہ کا آغاز ہو رہا ہے تو اس پر اُن کا پیچ و تاب کھانا بالکل ظاہر ہے۔ لہٰذا اگر یہ لشکر کے ساتھ جاتے تو ضرور کوئی خرابی پیدا کرتے اور کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کرتے۔ لہٰذا بہتر ہی ہوا کہ وہ نہیں گئے۔

سورۃ التوبہ' آیت ۴۹

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ﴾ ''اور ان (منافقین) میں سے وہ بھی ہے جو کہتا ہے''..... ﴿ائْذَنْ لِّيْ﴾ ''اجازت دے دیجئے مجھے''..... ﴿وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ﴾ ''اور نہ فتنے میں ڈالیے مجھے''..... ﴿اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ﴾ ''سنو! فتنے میں تو وہ گر چکے ہیں''..... ﴿وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۴۹﴾ ''اور بے شک جہنم گھیرے ہوئے ہے کافروں کو۔''

- اِس آیت میں ایک نہایت ہی بد باطن منافق جد بن قیس کے بظاہر تقویٰ کے پردے میں لپٹے ہوئے جھوٹے بہانہ کا ذکر ہے۔ اُس نے اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے عذر پیش کیا کہ آپ ﷺ روم کی طرف جا رہے ہیں۔ وہاں کی عورتیں بڑی حسین ہیں اور حسین عورت میری کمزوری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں رومی عورتوں کے فتنہ میں مبتلا ہو جاؤں۔ مجھے رخصت دیجئے اور فتنہ میں نہ ڈالیے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت کے ذریعے اُس بد بخت کی ظاہری پرہیزگاری کا پردہ چاک کر دیا اور فرمایا کہ گھر کی ٹھنڈی چھاؤں کو اللہ کی راہ کی تپتی دھوپ پر ترجیح دے کر وہ فتنہ میں تو پڑ چکا ہے۔ اب اُس کا ٹھکانا جہنم کی دہکتی ہوئی آگ ہے۔

- اِس آیت میں بیان شدہ قول کی ایک عمومی تفسیر بھی کی گئی ہے۔ بعض منافقین نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر بڑی بے شرمی سے کہا کہ ہمارے لیے سفرِ تبوک میں نکلنا ممکن ہی نہیں۔ اِس سفر میں نکلنا لازم کر کے ہمیں آزمائش میں مت ڈالیے۔ ہمیں اِس سفر میں شرکت سے رخصت دے کر ہماری کمزوری پر پردہ ڈالے رکھیے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کے اجتماعی تقاضے پر اپنے ذاتی کام کو ترجیح دے کر اور اللہ کی راہ کی مشکلات پر گھر کے آرام کو مقدم کر کے وہ فتنے میں تو پڑ چکے ہیں۔ چند دن اور عیش کر لیں' عنقریب جہنم کا شدید عذاب اُنہیں گھیرنے والا ہے۔
- درحقیقت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی پکار کے جواب میں عذر پیش کرنا اور رخصت طلب کرنا ایک کمزوری کی علامت ہے۔ خاص طور پر نفیر عام کے موقع پر رخصت چاہنا تو گویا اپنی کمزوری اور نامرادی پر مہر تصدیق ثبت کرانا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی محرومی و بدبختی سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین! ۞ ۞ ۞

بقیہ: نبی اکرم ﷺ کی شانِ رحمت

نوعِ انسانی کا قافلہ آج جن مصائب و آلام میں گرفتار ہے' اُن کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسانیت رحمۃ للعالمین ﷺ کے اُس سرمدی پیغام اور بابرکت نظام سے محروم ہے' جو آپؐ کی رحمۃ للعالمینی کا بہت بڑا مظہر ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام جو اس پیغام اور نظام کی حامل بنائی گئی تھی' اور جسے یہ فریضہ سونپا گیا تھا کہ اِسے دنیا کے سارے انسانوں تک پہنچائے گی' خود اس روشنی سے دور' افکارِ مغرب کے گھپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ اے انسانیت کے دعویدارو! اے دانش افرنگ کے پیروکارو! فکروں میں تغیر لاؤ۔ کانٹ' ہیگل' فرائڈ' نٹشے' مارکس' چانکیہ' میکاولی اور ان جیسے دیگر مفکرین کے افکار و نظریات کرۂ ارض کے ہمہ جہتی بگاڑ کا علاج نہیں ہو سکتے۔ اگر حالات کو بدلنا ہے اور دنیا کے چہرے پر لگے ظلم و استحصال اور جبر و استداد کے بدنما داغوں کو دھونا ہے' تو اس کا واحد راستہ محسن انسانیت ﷺ کے لائے ہوئے پیغام اور نظام کی پیروی ہے۔ اسی نظامِ رحمت کی ضو سے ظلمت کدۂ دہر کی تیرگی کا خاتمہ ہوگا' اور اسی پیغام آخریں کو حرزِ جان بنانے سے اخروی فلاح و سعادت کا در کھلے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی رحمت ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ☆☆

بخل اور اس کا انجام

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

رازق تو بس اللہ عزوجل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ﴾ (العنکبوت:٦٢) ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تھوڑی مقدار میں دیتا ہے''۔ یوں دولت مند بھی آزمائش میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق خرچ کرتا ہے یا اسے مادی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ عیش وعشرت میں پڑ کر فضول خرچ کرتا ہے اور ضرورت مند اور سوالیوں کی مدد کرنے کی بجائے اپنے مال کو سینت سینت کر رکھتا ہے۔ اسی طرح مفلس بھی آزمائش میں ہے کہ اپنی تنگدستی میں صبر کرتا ہے یا دوسروں کی خوشحالی دیکھ کر حسد میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اپنی کم آمدنی پر کڑھتا رہتا ہے۔ اگر دولت مند اپنی دولت کا استعمال اللہ کی رضا کے مطابق کرتا ہے تو کامیاب ہے اور مفلس اپنی مفلسی صبر اور سیر چشمی میں گزارتا ہے تو کامیاب ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت کو سنبھال سنبھال کر رکھنا' اسے گنتے رہنا اور اسے زیادہ کرنے کی فکر میں لگے رہنا اللہ کو پسند نہیں۔ ایسے لوگوں کی قرآن مجید میں مذمت کی گئی ہے:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿١﴾ نِ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ﴿٢﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿٣﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ۚ﴿٤﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۚ﴿٥﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۚ﴿٦﴾﴾ (الھمزۃ)

''خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی' جس نے مال سمیٹا اور گن گن کر رکھا۔ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال سدا اُس کے ساتھ رہے گا۔ ہرگز نہیں' وہ پھینکا جائے گا حُطَمَہ میں۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ حُطَمَہ کیا ہے؟ وہ ایک آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی۔''

گویا مال کے ساتھ از حد محبت کرنے والے کو عذاب کی وعید ہے۔ زائد از ضرورت مال کو اللہ تعالیٰ

کی راہ میں خرچ کرنا ضروری ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾ (البقرۃ:٢١٩) ''اور (اے نبی ﷺ!) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ تو ان کو بتا دیجیے کہ جو تمہاری ضروریات سے زائد ہے''۔ دولت مند کے پاس جو مال ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے اور وہ آزاد نہیں ہے کہ جس طرح مرضی خرچ کرے' بلکہ اگر فضول کاموں' رسموں اور رواجوں میں خرچ کرے گا تو فضول خرچ کہلوائے گا اور فضول خرچوں کو اللہ تعالیٰ شیطانوں کا بھائی قرار دیتا ہے: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ﴾ (بنی اسرائیل:٢٧) ''یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں''—— شیطان تو مردود اور لعین ہے' اس کا بھائی بند قرار دیا جانا تو بدترین ناکامی ہے۔

دولت کو بے جا اڑانا اور حاجت مندوں اور سوالیوں سے بچا بچا کر رکھنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ مالدار جس مال کو اپنا مال سمجھتا ہے وہ حقیقت میں اُس کا نہیں' بلکہ وہ مال تو اللہ کا ہے اور اس مالدار کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

ایں امانت چند روزہ نزد ماست　　درحقیقت مالک ہر شے خدا است

اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اپنے دیے ہوئے مال میں سے فی سبیل اللہ خرچ کرنے کو کہتا ہے اور اسے اپنے ذمہ قرض گردانتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس مال کو بے انتہا اضافے کے ساتھ واپس کرے گا۔ جیسا کہ سورۃ التغابن میں فرمایا: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۙ﴿١٧﴾﴾ ''اگر قرض دو اللہ کو اچھی طرح قرض دینا تو وہ دوگنا کر دے گا اس کو تمہارے لیے اور تمہیں بخش دے گا۔ اور اللہ بہت قدر دان ہے' تحمل والا''۔ پس اللہ کا دیا ہوا وافر مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہی عقل مندی اور دانائی ہے' کیونکہ جو مال انسان نے دنیا میں اپنی ضروریات میں خرچ کیا وہ تو اجر کے بغیر رہا اور جو فضول اور ناجائز کاموں میں لوٹایا وہ وبالِ جان بنے گا۔ اسی لیے سورۃ الحشر میں فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۙ﴿١٨﴾﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر شخص دیکھے کہ اُس نے کل (قیامت) کے لیے کیا آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' بے شک اللہ خبردار ہے اُس سے جو کام تم کرتے ہو''۔ معلوم ہوا کہ ہر وقت یہ خیال رہنا چاہیے کہ میں نے اپنی کمائی میں سے کتنا مال اپنی ضروریات میں خرچ کر لیا' کتنا فضول کاموں میں گنوایا اور کتنا آگے بھیجا ہے' یعنی آخرت کے خزانہ میں جمع

کرایا جس کا وافر اجر اُس وقت ملے گا جب اجر کی انتہائی ضرورت ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل ہمیں بتاتا ہے کہ آپؐ دنیوی زندگی کے عیش و آرام اور دولت مندی کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ آپؐ انفاق فی سبیل اللہ کو اولیت دیتے تھے۔ آپؐ نے اپنے خاندان سمیت کئی کئی دن فاقے میں گزارے' مگر جب بھی آپؐ کے پاس درہم و دینار آئے تو آپؐ نے فوراً اللہ کی راہ میں خرچ کیے۔ اس لیے کہ آپؐ جانتے تھے کہ وہی چیز کام آئے گی جو آدمی فی سبیل اللہ خرچ کر کے اپنی حقیقی زندگی کے لیے جمع کر لے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک بکری ذبح کی گئی اور اس کا گوشت تقسیم کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپؐ نے دریافت فرمایا کہ بکری میں سے کیا باقی بچا؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ بس اس کی ایک کتف (دستی) باقی رہ گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس دستی کے علاوہ جو اللہ کے لیے تقسیم کر دیا گیا دراصل وہی باقی ہے اور کام آنے والا ہے (یعنی آخرت میں ان شاء اللہ اس کا اجر ملے گا)۔'' (جامع ترمذی)

دولت مندی اور سرمایہ داری بظاہر بڑی نعمت ہے مگر یہ کڑی آزمائش ہے' کیونکہ دولت کو فی سبیل اللہ خرچ کرنا نفس پر شاق گزرتا ہے۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ آدمی مال و دولت اپنے عیش و عشرت پر خرچ کرے اور اپنے مال سے دُنیوی فوائد حاصل کرے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو آپؐ نے دیکھا تو فرمایا: ''ربِّ کعبہ کی قسم! وہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں''۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! کون لوگ ہیں جو بڑے خسارے میں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ لوگ جو بڑے دولت مند اور سرمایہ دار ہیں۔ ان میں سے وہی لوگ خسارے سے محفوظ ہیں جو اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں اپنی دولت کشادہ دستی کے ساتھ (خیر کے کاموں میں) خرچ کرتے ہیں' مگر دولت مندوں اور سرمایہ داروں میں ایسے بندے بہت کم ہیں۔'' (صحیح بخاری و صحیح مسلم) پس دولت جیسی آزمائش میں وہی شخص کامیاب ہوگا جو دُنیا سے دل نہ لگائے بلکہ اس کے نزدیک دولت کو فی سبیل اللہ خرچ کرنا اوّلین ترجیح ہو۔ مال جمع کرنا اور گن گن کر رکھنا اور اس سے صدقہ و خیرات نہ کرنا حقیقت میں نقصان ہی نقصان ہے۔ جو مال دار شخص اس معاملے میں شیطان کے ہتھے چڑھ گیا وہ برباد ہوگیا۔ سورۃ القلم میں باغ والوں کا قصہ مذکور ہے۔ باغ کا مالک اپنے باغ کی پیداوار سمیٹتا تو وہاں غریب اور مسکین لوگ بھی

اکٹھے ہو جاتے۔ وہ باغ کی پیداوار میں سے ان کو بھی دیتا۔ ایک وقت آیا کہ وہ شخص فوت ہوگیا۔ اس کے بیٹے باغ کے مالک بنے۔ بیٹوں نے سوچا کہ ہمارا باپ خواہ مخواہ باغ کی پیداوار کا ایک حصہ غریبوں' مسکینوں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ ہم ایسا نہیں کریں گے اور باغ کی ساری پیداوار خود ہی حاصل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ باغ کا پھل اتارنے کے لیے منہ اندھیرے باغ میں جائیں گے تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور ہم باغ کی ساری پیداوار خود ہی سمیٹ لیں گے۔ اگلے دن وہ صبح سویرے باغ کی طرف چل دیے مگر باغ تو اللہ کے عذاب کا شکار ہو چکا تھا۔ اوّل وہ سمجھے کہ رات کے اندھیرے میں وہ راستہ بھول گئے ہیں' مگر جلد ہی انہیں معلوم ہوگیا کہ باغ آفت کا شکار ہوگیا ہے۔ اب لگے پچھتانے' مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ انہیں معلوم ہوگیا کہ انہوں نے باغ کی پیداوار کا ایک حصہ غریبوں' مسکینوں سے روکا تو اس بخل کی پاداش میں ان کا پورا باغ ہی تباہ ہوگیا۔ ایسا ہی ایک قصہ سورۃ الکہف میں ہے۔ اگرچہ یہ دنیا دارالعمل ہے' یہاں نہ نیکیوں پر صلہ ملتا ہے نہ برائیوں کی سزا' مگر کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اس کے خلاف بھی کر دیتا ہے تاکہ لوگوں کے لیے عبرت کا باعث ہو' اگرچہ اصل صلہ تو دارالجزا میں ہی ملے گا۔

شیطان کو قرآن مجید میں بڑا دھوکے باز کہا گیا ہے' اس لیے کہ وہ برائیوں کو مزیّن کر کے دکھاتا ہے اور انسان اس کے پھندے میں آ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے کام کر گزرتا ہے۔ شیطان انسان کو ڈراتا ہے کہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے مال کم ہو جاتا ہے: ﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۶۸) ''بے شک شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ (فی سبیل اللہ خرچ کرنے پر) تم سے بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے''۔ مگر شیطان کے دھوکے سے بچنا بس خوفِ خدا رکھنے والوں ہی کا کام ہے' کیونکہ شیطان تو برائی کو خوبصورتی کے ساتھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ انسان بخل کو تو مفید سمجھنے لگتا ہے اور فی سبیل اللہ خرچ کو تاوان سمجھ لیتا ہے۔

سورۃ التوبہ (آیات ۷۵ تا ۷۷) میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے نواز دے گا تو ہم خوب صدقہ و خیرات کریں گے اور نیک بن جائیں گے۔ پھر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز کر غنی کر دیا تو انہوں نے اس مال و دولت کے ساتھ بخل کیا اور اعراض کرتے ہوئے پیٹھ موڑ لی۔ چنانچہ اللہ نے سزا کے طور پر ان

کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اُس دن تک جس دن یہ لوگ اللہ سے ملاقات کریں گے .....

روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے حق میں دولت مند ہو جانے کی دعا فرما دیجیے۔ آپؐ نے اسے نصیحت کی کہ وہ تھوڑی چیز اچھی ہے جس پر تو اللہ کا شکر ادا کرے اس زیادہ چیز سے جس کے تو حقوق ادا نہ کر سکے۔ اُس شخص نے اپنی بات پر اصرار کیا اور وعدہ کیا کہ اگر اللہ مجھ کو مال دے گا تو میں پوری طرح اس کے حقوق ادا کروں گا۔ آخر رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی۔ چنانچہ اس کی بکریوں میں اس قدر برکت ہوئی کہ مدینہ کے باہر ایک گاؤں میں رہنے لگا۔ مال اتنا بڑھا کہ اس میں مشغول ہو کر رفتہ رفتہ جمعہ و جماعات بھی ترک کرنے لگا۔ اس طرح مرضِ نفاق نے اس کے دل میں ڈیرہ جما لیا۔ کچھ دنوں بعد حضور ﷺ کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے والے پہنچے تو کہنے لگا کہ زکوٰۃ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے۔ پہلے تو اس طرح کہہ کر ٹالتا رہا' پھر زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ آپ ﷺ اس کے اس رویے پر خفا ہوئے کہ خود ہی دولت کے لیے اصرار کیا اور دولت کا حق ادا کرنے کا وعدہ کیا' مگر جب دولت ملی تو وعدہ بھول گیا۔ بعد ازاں وہ خود بادلِ نخواستہ مالِ زکوٰۃ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے تیری زکوٰۃ قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ یہ سن کر اس نے بہت واویلا کیا' کیونکہ حضور ﷺ کا زکوٰۃ قبول نہ کرنا اس کے لیے بڑی عار کی بات تھی۔ بدنامی کے تصور سے سر پر خاک ڈالتا تھا مگر دل میں نفاق چھپا ہوا تھا۔ پس اس کی زکوٰۃ قبول نہ ہوئی۔ حضور ﷺ کے بعد وہ زکوٰۃ لے کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا' انہوں نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کی' ان دونوں نے بھی انکار کر دیا۔ ہر ایک نے یہی کہا کہ جو چیز نبی کریم ﷺ نے رد کر دی ہم اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ آخر اسی حالت نفاق میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں مر گیا۔ مال کا حق ادا نہ کرنا منافقت کا نتیجہ ہے۔ اس شخص نے اصرار کر کے حضور ﷺ سے دولت مندی کی دعا کرائی اور انفاق فی سبیل اللہ کا وعدہ کیا' مگر حرص و لالچ میں پڑ کر وعدہ بھول گیا۔ چنانچہ اس بخل کی یہ سزا ملی کہ اس کی موت نفاق پر ہی واقع ہوئی۔ (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

انفاق فی سبیل اللہ کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کو دنیا میں بھی خوشحالی اور سکون ملتا ہے' جبکہ عاقبت کا ثواب تو مسلّم ہے۔ اس کے برخلاف بخیل کو دنیا میں بھی

ذلت ملتی ہے اور آخرت کی سزا کی وعید تو ہے ہی۔ سورۂ محمد کی آخری آیت کے الفاظ ہیں:

﴿هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ﴾ (آیت ۳۸) ''تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں بلایا جا رہا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ پس تم میں سے کوئی وہ بھی ہے جو بخل سے کام لیتا ہے' اور جو کوئی بھی بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے''۔ یعنی اگر وہ بخل نہ کرتا تو اس کا فائدہ ہوتا' مگر اب بخل کیا' یعنی مال کو سنبھال سنبھال کر اپنے پاس رکھا اور فی سبیل اللہ خرچ نہ کیا تو گویا آخرت کے فائدے سے خود ہی محروم رہا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اور اس کو بندوں کے مال کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تو بندوں کو فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ وہ دنیا میں عزت اور آخرت میں ثواب حاصل کریں۔ بخیل آدمی مال سمیٹ سمیٹ کر رکھتا ہے اور خوش ہوتا رہتا ہے کہ اس کے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی۔ لیکن وہ اسی حال میں مر جاتا ہے تو اپنی دولت یہیں چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے وارث اس دولت کو جیسے چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ نیکی میں خرچ کریں گے تو ثواب پائیں گے مگر دولت چھوڑ کر مرنے والے کو اس کا کچھ ثواب نہیں ملے گا' بلکہ فی سبیل اللہ خرچ نہ کرنے کی بنا پر سزا پائے گا۔ سورۃ التوبہ میں ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝﴾

''اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو خوشخبری سنا دیجیے ایک دردناک عذاب کی۔ جس دن اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کے چہرے اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔ (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے جمع کر رکھا تھا اپنے واسطے' پس اب مزا چکھو اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا۔''

اللہ تعالیٰ چاہتا تو ناداروں کو بھی فراخ روزی دیتا' مگر اُس نے دولت مندوں کو یہ اعزاز دیا کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے ناداروں کو دیں۔ سورۃ الذاریات میں یہاں تک بتا دیا گیا ہے کہ امیروں کی دولت میں غریبوں کا حصہ شامل کر دیا گیا ہے: ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝﴾۔ پس جو مالدار غریبوں میں دولت تقسیم کرتا ہے وہ ان پر احسان نہیں کر رہا ہوتا بلکہ ان کا مال ہی انہیں دے رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص بھوکے کو کھانا کھلا

رہا ہوتا ہے تو وہ بھوکے کا کھانا ہی اس کو دے رہا ہوتا ہے' اپنی طرف سے کچھ نہیں دے رہا ہوتا۔ سورۃ الماعون میں اسی لیے طعامُ المِسکِیْنِ (مسکین کا کھانا) کے الفاظ آئے ہیں۔

نفاق نفس کی ایک قبیح بیماری ہے اور اس کا علاج ''اِنفاق'' ہے۔ جو شخص انفاق فی سبیل اللہ پر قادر ہو گیا وہ نفاق سے بچ گیا۔ اس بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾ (الحشر:۹' التغابن:۱۶) ''اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں''۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ پاکیزہ شخصیات تھے کہ اللہ تعالیٰ بھی ان کی تعریف کرتا ہے۔ ان کے سیرت و کردار میں ہمیں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں کہ وہ اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن میں حرص و لالچ نہ تھا بلکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے فقر اور ایثار سیکھا تھا۔ اگر وہ اپنے پاس کوئی چیز نہ پاتے تھے جس سے کسی ضرورت مند کی مدد کر سکیں تو پریشان ہو جاتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جائے خواہ کسی سے قرض ہی لینا پڑے۔ سورۃ الحشر میں ارشاد ہے: ﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (آیت ۹) ''وہ ان (مہاجرین) کو اپنی جان پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود فاقے سے ہوں''۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (البقرۃ:۲۶۷) ''اے اہلِ ایمان! خرچ کرو پاکیزہ چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو ہم نے نکالی ہیں تمہارے لیے زمین میں سے''۔ گویا مال' درہم و دینار کی صورت میں ہو یا زمین کی پیداوار ہو اس میں سے مستحقین کو دینا فرض ہے اور اسی کا نام زکوٰۃ اور عشر ہے۔ مال سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو مال پاک ہو جاتا ہے۔ ہاں زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد بھی اگر وافر مقدار میں مال ہو تو اس سے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے بے انتہا ثواب کمایا جا سکتا ہے۔

زکوٰۃ تو اسلام کا رکن ہے۔ یہ فرض ہے جس طرح نماز فرض ہے۔ جو شخص اس قدر لالچی اور بخیل ہے کہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں کرتا تو ایسا شخص دوسروں کا حق کھانے کے گناہ کا ارتکاب بھی کرتا ہے اور زکوٰۃ ادا نہ کر کے اپنے رازق کی نافرمانی بھی کرتا ہے۔ انسانیت تو یہ ہے کہ اگر کسی کو بھوکا پیاسا دیکھا جائے تو اس کی بھوک پیاس دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ انسان تو انسان ہے' اگر کوئی جاندار بھی بھوکا پیاسا ہو تو اس کی بھوک پیاس دور کر کے

اجر کی امید رکھی جائے۔

شیطان کا یہ بڑا مہلک وسوسہ ہے کہ انسان سوچتا ہے کہ ابھی میرے پاس بہت تھوڑا مال ہے لہٰذا جب زیادہ مال آئے گا تو اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا۔ جو شخص اس وسوسے میں گھر گیا وہ ہمیشہ یہی سمجھتا رہے گا کہ میرے پاس مال ابھی کم ہے۔ اس کا توڑ یہ ہے کہ انسان اس وسوسے میں نہ پڑے اور اگر اس کے پاس مال کم ہے تو اس میں سے بھی اللہ کی راہ میں دے اور اگر زیادہ ہو تو زیادہ دے۔ کسی وقت اپنے آپ کو نہ دینے والوں کی فہرست میں شامل نہ کرے۔ یہ مثبت رویہ انسان کو مال کی محبت میں گرفتار ہونے سے بچاتا ہے۔

دنیا کے مال و منال کی محبت انسان کی کمزوری ہے' کیونکہ مال و دولت کے ساتھ دنیوی نعمتیں حاصل کی جا سکتی ہیں اور ہر شخص کا دل چاہتا ہے کہ اس کے پاس زیادہ سے زیادہ سہولتیں ہوں۔ اس طرح وہ مال و دولت کی کسی مقدار پر قناعت نہیں کرتا' بلکہ اور زیادہ کے حصول میں منہمک رہتا ہے۔ اسی چیز کو سورۃ التکاثر میں بیان کیا گیا: ﴿اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲﴾ ''تمہیں کثرت کی خواہش نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھ لیں (کہ تم مر کر قبروں میں چلے گئے)''۔ یعنی دنیا میں لالچ کرتے کرتے اور مال جمع کرتے کرتے تم اپنی عمر ختم کر چکے۔ اب مرنے کے بعد جب آخرت کا منظر سامنے آئے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے دنیا کا مال اکٹھا کرنے میں عمر کے قیمتی لمحات کیوں ضائع کیے۔ مال کی حرص پر قابو پانا ہی مطلوب ہے' ورنہ دولت مذموم نہیں ہے۔ دولت کے ساتھ آدمی قسم قسم کے نیک کام کر سکتا ہے۔ دولت مندی اور چیز ہے اور دولت کی حرص دوسری شے ہے۔ دولت کا صحیح استعمال آدمی کو نیک بناتا ہے۔ حضرت سید عبدالقادر جیلانی' امام اعظم ابوحنیفہ' حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہم اللہ بہت دولت مند لوگ تھے۔ انہوں نے اپنی دولت کو فی سبیل اللہ پانی کی طرح بہایا اور دولت کے ساتھ پیار نہ کیا' یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ بطور دولت مند مشہور نہ ہوئے بلکہ لوگ انہیں اللہ کے فرمانبردار بندوں کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ دولت کو جمع کر کے رکھنے کو سخت ناپسند کرتے تھے بلکہ اس کی بدانجامی سے ڈراتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر آدم کے بیٹے کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری تلاش کرے گا۔ اور آدم کے بیٹے کے پیٹ کو تو صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے' اور جو شخص توبہ کرے اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے''۔ (عن ابن عباس' فی البخاری)۔ اس حدیث میں

آپ ﷺ نے دولت اکٹھی کرنے کی بدانجامی بتادی۔ یہ تنبیہہ آپؐ نے بار بار کی تاکہ امت کے لوگ اس مشغلے سے باز رہیں۔ جس طرح افراد بخل کا شکار ہوکر اپنی عاقبت برباد کر لیتے ہیں اسی طرح بخل کی یہ بیماری قوموں کو بھی لاحق ہو جاتی ہے اور پوری قوم دنیا میں ذلت کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی رسول اللہ ﷺ کی راہنمائی موجود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(غیر مسلم) اقوام تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانا کھانے والے کھانے کے پیالے پر ٹوٹ پڑتے ہیں''۔ اس پر ایک صاحب نے پوچھا: کیا یہ اس لیے ہوگا کہ ہم اس زمانے میں بہت تھوڑے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ تم لوگ اُس وقت تعداد میں بہت زیادہ ہوگے' لیکن تمہاری حیثیت اس خس و خاشاک کی ہوگی جسے سیلاب بہا کر لاتا ہے۔ اللہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری پیدا کر دے گا''۔ کہنے والے نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! وہ کمزوری کیا ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت''۔ (عن ثوبان' فی ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ نے مال و دولت جمع کرنے کی مذمت اکثر مواقع پر فرمائی۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر اُمت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال و دولت ہے''۔ (عن کعب بن عیاض' فی الترمذی) بخل وہ فتنہ ہے جس کی شناعت آپؐ نے ہر طرح سے واضح کر دی۔ آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ آپؐ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ آپؐ کے پاس چند درہم و دینار ایک دن کے لیے پڑے رہیں بلکہ آپؐ کے پاس جو کچھ آتا وہ فی سبیل اللہ خرچ کر دیتے اور اپنے لیے فقر کو پسند فرماتے۔ آپؐ کے اصحاب کا رویہ بھی یہی تھا' ان میں جو دولت مند تھے وہ اپنی دولت کو صدقات و خیرات اور دین اسلام کی سربلندی کی جِدّوجُہد میں بے دریغ خرچ کرتے تھے۔

آج بھی دولت کے فتنے سے بچنے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جائز ذرائع سے دولت کمائی جائے۔ تاہم اس مال و دولت سے اس طرح پیار نہ کیا جائے کہ وہ حاجت مندوں اور غریبوں پر خرچ نہ کی جائے اور اسے دین اسلام کی سربلندی کے لیے کام میں نہ لایا جائے۔ یہ ایک مؤمن کی شان سے بعید ہے کہ اس کے پاس مال و دولت موجود ہو مگر اس کے اردگرد غریب مسکین اور نادار موجود ہوں اور مفلسی کی تکلیف اٹھا رہے ہوں اور وہ خبر رکھنے کے باوجود ان کی مدد نہ کرے یا دین اسلام کی سربلندی کی جدوجہد ہو رہی ہو اور وہ پیسے سنبھالے ہوئے ہو۔ اللہ تعالیٰ بخل سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین!

دینی تحریکوں اور مکاتبِ فکر
کے تنقیدی اسلوب کا جائزہ

خالد جامعی

قرآن اکیڈمی لیبین آباد کراچی کے مرکز تعلّم وتحقیق کے تحت محترم خالد جامعی صاحب کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ آپ جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف وتالیف و ترجمہ کے ڈائریکٹر ہیں اور اسی شعبہ سے شائع ہونے والے مجلّہ ''جریدہ'' کے ضخیم نمبر اور ماضی قریب کے ایک اہم علمی مجلّے ''ساحل'' کے مدیر بھی ہیں' مزید یہ کہ آپ تحریکاتِ اسلامیہ اور علماء کرام کے کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور گاہے بہ گاہے اپنے مفید مشوروں اور تجزیوں سے بھی نوازتے رہتے ہیں۔ اس موقع پر موصوف نے ''دینی تحریکوں اور مکاتب فکر کے تنقیدی اسلوب کا جائزہ'' کے عنوان سے گفتگو فرمائی۔ افادۂ عام کی غرض سے آپ کی گفتگو کو ادارے کے استاذ جناب ابرار حسین نے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے' جسے بصورت مضمون پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

اہلِ سُنّت والجماعت سے وابستہ مختلف تحریکیں' گروہ وشخصیات دین کے مختلف پہلوؤں پر مصروفِ عمل ہیں۔ الحمدللہ یہ ساری جِدّوجُہد خیر وبرکت کا سبب ہے' مگر غور طلب معاملہ یہ ہے کہ تمام ہی اسلامی ممالک میں ہونے والی یہ بھرپور جدوجہد اسلامی انقلاب کے لیے ہماری آرزوؤں کو پورا کرنے میں بہت زیادہ کامیاب نظر نہیں آتی۔ ویسے تو اس کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں' مگر ان میں سے ایک اہم سبب ان تحریکوں وتنظیموں کے درمیان تلفیق وتطبیق کا مفقود ہونا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان تحریکوں اور تنظیموں کا پس منظر بھی ایک ہوتا ہے اور ہدف بھی' لیکن محض طریق کار کے اختلاف کی وجہ سے دلوں میں دوری ہوتی ہے۔ اگر ان تنظیموں میں رابطے کا سلسلہ بڑھ جائے' ایک دوسرے کی سوچ اور کام کے طریق کار پر آپس میں گفت وشنید ہوتی رہے تو رفتہ رفتہ یہ قوتیں ایک نقطے یعنی ''دین کی سربلندی'' پر متفق ہوسکتی

ہیں اور نتیجتاً احیاء اسلام کے حوالے سے ہماری تمنائیں بر آنے کے واضح امکانات روشن ہوسکتے ہیں۔ گزشتہ سالوں میں دینی حلقوں کے مابین تنقید کے اسلوب کا جائزہ لینے پر بھی اس خیال کو مزید تقویت حاصل ہوئی ہے کہ اگر ان حلقوں میں ربط وضبط پیدا ہوجائے تو اسلامی انقلاب کی منزل دور نہیں۔

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ دینی حلقوں میں ربط وضبط اور ایک دوسرے کے نظریات میں تطبیق تو کیا ہوگی' ایک دوسرے کے لیے نرم گوشہ بھی موجود نہیں' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اپنی جماعت' گروہ یا مسلک کو ہی ''الحق'' سمجھنا' اپنے کام کو ہی ''العلم'' سمجھنا اور دوسری جماعتوں یا مسلکوں کو اپنے سے کم تر سمجھنا ہمارے حلقوں کا امتیازی وصف بن کر رہ گیا ہے۔

دیکھا جائے تو دین کے تمام شعبہ جات میں کام کرنے والوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ اس طرح ہر شعبہ دوسرے شعبہ کی تردید یا تنسیخ کی بجائے تکمیل کا سبب ہونا چاہیے۔ لیکن نشست وبرخاست اور اندازِ گفتگو پر نظر ڈالی جائے تو تقریباً سب ہی کے طرزِ عمل میں جارحانہ رنگ نمایاں ہے۔ چناں چہ مخالفین پر تنقید کی کوشش میں خود کو برتر اور دوسرے کو کم تر ثابت کرنے پر ہی ساری توانائی خرچ کردی جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم اپنے کام کو کسی بھی دوسرے شخص کے کام سے افضل نہ سمجھیں' اس لیے کہ عموماً شعبہ جات کے انتخاب کا تعلق انسان کے ذوق' دلچسپی اور مہارت سے ہوتا ہے۔ بہت کم ایسی شخصیات ہوتی ہیں جنہیں دین کے تمام شعبہ جات میں کوئی تخصیص یا مہارت حاصل ہو۔ جیسا کہ امام غزالی' امام ابن تیمیہ' حضرت مجدد الف ثانی یا پھر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم کی شخصیات کو بطورِ مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح عصرِ حاضر میں ہماری اکثریت ایک اور مہلک فتنے ''آزادئ اظہارِ رائے'' میں مبتلا ہے' نتیجتاً ہر فرد ہر مسئلے سے متعلق ہمہ وقت گفتگو اور بحث ومناظرہ کے لیے تیار رہتا ہے' چاہے اس مسئلے سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ ہو' اور وہ نہ صرف اپنی رائے رکھتا ہے بلکہ اسی کو حق سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رائے کو چاردانگِ عالم میں پھیلانے کا جذبہ بھی اس کے دل میں ہمہ وقت موج زن رہتا ہے۔

ایک اور بڑی اہم کم زوری بلکہ خرابی کہہ لیں' ہمارے حلقوں میں یہ پائی جاتی ہے کہ کسی شخصیت کی تحریر یا تقریر کے ایک جملے سے اس کی مکمل شخصیت کے بارے میں رائے قائم کرلی جاتی ہے' جو اکثر وبیشتر غلط ہی ہوتی ہے اور اس کا استعمال بھی محض پروپیگنڈے کے طور پر کیا

جاتا ہے‘ حالاں کہ یہ عمل نہ صرف اخلاقی پستی ظاہر کرتا ہے بلکہ اس شخصیت کے ساتھ بھی انتہا درجہ کی ناانصافی ہے‘ بلکہ مزید غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ ہمارا یہ عمل علومِ دینیہ سے ناواقفیت یا دوری کی وجہ سے ہے۔ ہمارے اَسلاف کا معاملہ تو یہ رہا کہ انتہائی مجبوری میں کسی شخص کے بارے میں کچھ کہنا بھی پڑا تو اس کی شخصیت‘ احوالِ زندگی وغیرہ کو کھنگالنے کے بعد رائے قائم کرتے تھے۔

علمِ دین سے متعلق افراد امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے خوب واقف ہیں۔ مشہور ہے کہ آپؒ کئی معاملات میں منفرد رائے رکھتے تھے۔ آپؒ کی تحریریں بھی عموماً اجماعِ امت سے مختلف ہیں‘ مگر اس سب کے باوجود آپؒ کے عالی مقام و مرتبہ سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

جب بھی کسی شخص کی ایک شاذ رائے پر یا اس کے کسی منفرد قول‘ تقریر یا تحریر کی بنیاد پر اس کی پوری شخصیت کا خاکہ بنایا جاتا ہے تو اکثر و بیشتر غلطی ہی مقدر ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات ہمارے ذہن میں رہنی چاہیے کہ کسی شخص کے بارے میں ہماری زبان سے نکلا ہوا کوئی لفظ اس کی عاقبت اور آخرت کا فیصلہ کرنے کی بجائے ہماری آخرت و عاقبت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَاِذَا قَالَ اَحَدُھُمَا لِلْآخَرِ اَنْتَ کَافِرٌ فَقَدْ کَفَرَ اَحَدُھُمَا)) (الادب المفرد)

’’جب کوئی دوسرے کو کافر کہتا ہے تو ان دونوں میں سے کوئی ایک کافر ضرور ہو جاتا ہے۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ اسلامی لٹریچر میں معتد بہ تعداد میں وہ روایاتِ حدیث موجود ہیں جن میں زبان کے صحیح استعمال کی ترغیب اور برے استعمال پر وعید بیان کی گئی ہے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے مناظروں پر نظر ڈالی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید گلی کوچوں میں جہلاء کے ہاں استعمال ہونے والی گفتگو دین کے ان نمائندگان سے کئی درجے بہتر ہوگی‘ جب کہ وراثتِ انبیاء کے تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے علم بردار اوصافِ حمیدہ رکھتے ہوں‘ نہ کہ اپنے مسلک اور گروہ کو ہی ’’الحق‘‘ تسلیم کروانے کے لیے زور آزمائی شروع کر دیں۔ اصطلاح ’’الحق‘‘ یا اس طرح کی دوسری اصطلاحات کی معرفت بھی تمام مکاتبِ فکر کے لیے لازم ہے۔ الحق کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ ظَاھِرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ))

(صحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ)

’’میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے گا جو حق پر قائم ہوگا۔‘‘

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی شرح میں فرمایا ہے کہ یہ گروہ متفرق افراد پر مشتمل

ہوگا جنہوں نے مقاصد کے اعتبار سے اپنے لیے مختلف جہتوں کا انتخاب کیا ہوا ہوگا۔ بالفاظ دیگر یہ گروہ دنیا کے ہر حصے میں ہوگا اور ہر حال میں حق پر قائم رہے گا‘ یعنی کسی خاص جغرافیائی خطے میں محصور‘ کسی خاص نظم‘ حلقے‘ امارت‘ امامت‘ نظامت کے تحت ہی محصور نہیں ہوگا۔ الحمدللہ امت میں ایسے افرادِ کار و علماء آج بھی دنیا کے ہر حصے میں ملتے ہیں جو ہر دینی تحریک اور مکتبِ فکر میں اس حدیث کے مطابق اہل حق کی صورت میں موجود ہیں۔ مزید برآں‘ اَسلافِ امت کی روایت بھی یہی رہی ہے کہ اسلامی تحریکات‘ گروہ و مکاتبِ فکر ایک دوسرے کا احترام کریں اور حق پر قائم اَفراد سے ربطِ مسلسل رکھیں‘ اور ایک دوسرے کی مدد‘ اصلاح اور درستی کے اہم کاموں میں نہایت اخلاص کے ساتھ مصروفِ عمل رہیں۔

مختلف مکاتب فکر کے مابین تعلق کی نوعیت کس طرح کی ہونی چاہئے؟ اس ضمن میں مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خط سے اقتباس پیش خدمت ہے جو انہوں نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے نام تحریر کیا تھا:

> ’’دہلی کے اکثر علماء نے (مولانا نذیر حسین محدث دہلویؒ کے سوا) اس ناکارہ کے کفر کا فتویٰ دیا ہے (’’تحذیر الناس‘‘ پر علماء بریلوی کے فتوے کا ذکر ہے) اور فتویٰ پر مہریں کرا کر علاقے میں ادھر اُدھر مزید مہریں لگوانے کے لیے بھیج دیا ہے۔ احباب اس فتوے کے جواب کی امید کر رہے ہیں مگر میں نے اپنے اسلام پر ننگ کفر سمجھ کر خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے کہہ دیا ہے کہ اس کا جواب انہی (جواب لکھنے والوں) کی تکفیر ہوگی اور یہ مجھ سے نہ ہوگا‘ کیوں کہ میں ان (لوگوں) کو اس زمانے کے اہل ایمان کا رہ نما جانتا ہوں۔‘‘ (نورالحسن راشد‘ قاسم العلوم‘ مولانا قاسم نانوتوی‘ مکتوب مولانا قاسم‘ ص ۳۰۸‘۳۰۹‘ طبع اول‘ دسمبر ۲۰۰۰‘ مکتبہ سید احمد شہید لاہور)

بلادِ اسلامیہ میں ہر دور میں ایسی شخصیات موجود رہیں جو تمام مکاتب فکر کے نزدیک یکساں احترام کی حامل ہیں‘ مثلاً شیخ علوی مالکیؒ اور علامہ زاہد الکوثریؒ کا احترام دیوبندی اور بریلوی مکاتب فکر میں یکساں طور پر کیا جاتا ہے۔ مزید برآں ایسے گروہ اور جماعتوں کی بھی کمی نہیں کہ جو دیگر مکاتب فکر پر تنقید کے ضمن میں توازن و اعتدال اور حسن اختلاف کی زندہ مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کا مکتبِ فکر‘ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا مکتبہ فکر‘ پیر مہر علی شاہؒ یعنی گولڑہ شریف کا مکتبہ فکر‘ ندوۃ العلماء کا مکتبہ فکر‘ پھلواری شریف کا مکتبہ فکر‘ ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاریؒ کا مکتبہ فکر‘ الاخوان المسلمون کا مکتبہ فکر‘ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا مکتبہ فکر۔

وہ افراد جن کی زندگی علومِ دینیہ سے وابستہ ہے اور اسی خدمت سے وابستہ ہونے کی بنیاد پر انہیں تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے‘ انہیں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اپنے عقیدے یا عمل میں غلطی تسلیم کر لینا اس دارالامتحان کی کڑی آزمائش ہے‘ اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ ہر بڑی آزمائش کی طرح اس میں بھی پورا اترنے والے کے لیے بڑا اجر ہے۔ چناں چہ تنقید کے جواب میں ایک ہی رویہ ایسا ہے جو روزِ آخرت میزان کو بھر دے گا‘ یعنی اپنی رائے میں غلطی کے امکان کو مان کر تنقید کو دیکھا جائے اور دل میں بھی یہی خیال موج زن رہے کہ عین ممکن ہے کہ یہ تنقید کسی حق کو دریافت کر لینے میں مددگار ثابت ہو۔ دوسری جانب نقاد حضرات کا اصل محرک دین کی خیر خواہی اور فرد سے ہم دردی ہو‘ نیز اپنی ذات سے غلطی ہو جانے کے امکان کو بھی موجود رکھیں۔ مزید برآں تنقید نفس مسئلہ تک محدود رہے نہ کہ فردِ مخالف کی ذات کو تمسخر و تضحیک کا نشانہ بنایا جائے۔ جب کہ دوسری جانب مثبت تنقید کی مثالوں کی بھی الحمدللہ ہمارے ہاں کمی نہیں ہے۔ جیسے:

☆**تصفیۃ العقائد** از مولانا قاسم نانوتویؒ ☆ **تصفیۃ بین الشیعۃ والسّنۃ** از پیر مہر علی شاہؒ گولڑہ شریف ☆ انوارِ تجلیات‘ از مولانا معین الدین اجمیریؒ ☆ **اتہام الحجّۃ** از مولانا لطف علی گڑھی ☆ خطباتِ حکیم الامت‘ از قاری محمد طیب ☆ جواہر الفقہ (مقالہ سنت و بدعت) از مفتی محمد شفیعؒ ☆ ضیاء القرآن‘ از پیر کرم علی شاہؒ ازہری ☆ تبیان القرآن‘ از علامہ غلام رسول سعیدی ☆ عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح‘ از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ☆ قادیانیت‘ از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ☆ پرانے چراغ‘ از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ☆ حضرت امیر معاویہؓ اور تاریخی حقائق‘ از مفتی تقی عثمانی صاحب ☆ جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ‘ از ڈاکٹر اسرار احمدؒ ☆ فکر غامدی‘ از حافظ ڈاکٹر محمد زبیر ☆ **نزھۃ الخواطر** از مولانا عبدالحی لکھنوی ☆ معاصرین‘ از مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ ☆ سنت کی آئینی حیثیت‘ از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ☆ مہر منیر‘ از فیض احمد فیض گلہڑوی۔ ❁❁❁

قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ

ذُوالقرنین، سدِّ ذُوالقرنین اور --- یاجوج ماجوج (۵)

شاہین عطر جنجوعہ ☆

سارگون اوّل (3800 ق م) سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ ایک طرف بحیرۂ متوسط (Mediterranian) اور دوسری طرف شمالی پہاڑوں کی طرف توسیع کا دور۔ البتہ مقامی بالادستی ایک شہر سے دوسرے شہر کو منتقل ہوتی رہی۔

تیسرے دور میں جو بیک وقت ایک دور کا اختتام اور ایک نئے دور کا آغاز تھا' بالآخر بابلونہ کے اقتدار کی مضبوطی کا دور ہے۔ شہر بابلونہ کے اندر اور باہر بادشاہ کے اقتدار کی مضبوطی کا دور جس سے بعد میں حکومت اور علاقے کا نام بھی بابلونہ پڑ گیا۔

شہری بادشاہتوں سے آگے بڑھ کر ایک ''سلطنت'' (جو شہروں پر مشتمل ہوتی ہے) کے قیام کی ابتدا سارگون اول (Sargon I) نے 3800 ق م میں کی۔ وہ Nippur' Shiprule, Kish' Babylon اور Uruk کا حکمران بن گیا۔ ان سرحدوں سے پرے اس کا بیٹا اپنی فوجیں مغرب میں Medditerranian' شمال میں آرمینیا' مشرق میں Elam' جنوب میں عرب اور خلیج فارس تک لے گیا۔ ان بادشاہوں کی سرگرمیوں سے پرانے شہری بادشاہوں کی سرگرمیوں کا خاتمہ ہو گیا اور آئندہ کی نسل کے لیے مثال قائم ہو گئی۔

3000 ق م میں اُر (Ur) شہر کے بادشاہ Urgur اور اس کے بیٹے نے آگے بڑھ کر بابلونہ کے الحاق میں مزید کردار ادا کیا۔ وہ شمال میں Kutha سے جنوب میں Ur' Uruk اور Nipper کے حکمران تھے۔ اُر (Ur) کے بادشاہ کے بعد کے دورِ

☆ ''بحث ونظر'' کے عنوان سے شائع شدہ مضامین کے مندرجات سے ادارۂ میثاق کا اتفاق ضروری نہیں۔ وضاحت طلب امور کے لیے صاحب مضمون سے رابطہ کیا جاسکتا ہے:

(فون:03345080530) ای میل: shaeenattar@yaho.com

حکومت (2800 تا 2500 ق م) میں سلطنت بہت وسیع رقبے پر پھیلی تھی۔

Dungi دوم نے جو پچاس سے زیادہ سال حکمران رہا کم از کم نو (9) مہمات مغرب کو بھیجیں۔ اور لگتا ہے اس نے اپنے خاندان کے لوگوں کو مفتوحہ شہروں میں انتظام کے لیے بھیجا۔ اس کی موت کے بعد اسی کو پوجا جاتا اور سال کا آٹھواں مہینہ اس کے نام پر کر دیا گیا۔ یہ خاندان بابل کے اُس وقت تک کے حکمران خاندانوں میں سب سے نمایاں ہے۔

عیلامیوں نے 2290 ق م میں یلغار کر کے نانا (Nana) دیوی کا بت Uruk سے اٹھا لیا تھا۔ جس علاقے میں Larsam اور Uruk تھے اس علاقے نے بہت نقصان اٹھایا۔ عیلامیوں نے بابلونہ میں جنوبی شہری ریاستوں کی ایک عمومی بربادی کی۔ ان (ریاستوں) کے حکمران معزول کیے' لوگوں کو غلام بنایا' ان کے املاک اٹھا لیے گئے۔ اکھڑ غیروں کے سامنے مغلوب' وہ دوسری ریاستوں سے اپنی پرانی عداوت ورقابت برقرار نہ رکھ سکے۔

اس کے بعد 1980 ق م میں اشوری سلطنت وجود میں آئی جو 539 ق م تک برقرار رہی۔

بابل یا Mesopotamia کی تہذیب میں ترقی کے یہ مراحل اور سلطنت وحکومت کی یہ آویزش اسی علاقے سے مخصوص کیوں ہوئی؟ اس سوال کا جواب معاصر سلطنت مصر کے مطالعے سے مل سکتا ہے' کیونکہ مصر بھی ایک طویل دریا نیل کے اردگرد کے زرخیز علاقے کی سلطنت تھی۔ لہٰذا وہاں بھی آبادکاری اور سیاسی کشمکش کے آثار تو ملنے چاہئیں لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مصر میں ایسی کوئی کشمکش نہیں ملتی۔ اس کی کچھ وجوہات ہیں۔

مصر میں تمام زمین کا مالک ''بادشاہ'' تھا۔ وہ زمین پر ''خدا'' ہوتا تھا' یعنی محض خدا کا مقرر کردہ یا نمائندہ نہیں بلکہ خود ''خدا''۔ تمام عوام زمین پر اس ''خدا'' کی خدمت پر مامور تھے۔ نجی یا ذاتی ملکیت کا کوئی تصور نہیں تھا' اشیاء کے تبادلے کے لیے barter کا نظام رائج تھا۔ یعنی مثلاً اناج کے بدلے کوئی ضرورت کی شے لی جاسکتی تھی۔ وہاں کرنسی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور بہت بعد میں جو ہوئی تو وہ بھی نام کی۔ پھر مصر کی زراعت بھی تقریباً 2900 ق م میں شروع ہوئی' جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ بھی بابلونہ کی ٹیکنالوجی کے انتقال سے شروع ہوئی۔ لہٰذا مصر کی زراعتی زندگی کی ابتدا اوّلاً میسوپوٹیمیا کے بہت بعد میں ہوئی۔ اس کے علاوہ مصر میں میسوپوٹیمیا کی تہذیب کے دیگر تمدنی وسیاسی عناصر داخل یا ایجاد نہیں ہوئے لہٰذا مصری معاشرہ تمدنی' سیاسی اعتبار سے تقریباً جامد معاشرہ تھا۔ جبکہ میسوپوٹیمیا میں تہذیبی' تمدنی اور سیاسی کشمکش آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی۔

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ میسوپوٹیمیا (دجلہ وفرات کے درمیان کا علاقہ) انسانی تاریخ میں پہلا مقام ہے جہاں یہ تبدیلیاں آئیں:

(1) آبادکاری کی زندگی شروع ہوئی۔

(2) زراعت پر مبنی معاشرت اور معیشت متعارف ہوئی۔

(3) چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں وجود میں آئیں۔

(4) شہری ریاستوں میں مذہب، حکومت، دولت کے محرکات کی وجہ سے مسابقت شروع ہوئی اور سلطنت وجود میں آئی۔

(5) معاشرت ومعیشت کے لیے ضروری علمی، عملی اسباب، تکنیکیں ایجاد ہوئیں، مثلاً خوراک کی تقسیم کا نظام، زبان، حساب کتاب، تحریر، مسائل، مثلاً جاگیردار / کاشت کار کا مسئلہ، قرض، سود مسئلہ، جنگوں کا سلسلہ وغیرہ۔

اس محدود سے میدانی علاقے اور نیل کے اردگرد (مصر کے سوا تقریباً پوری معلوم دنیا) خانہ بدوشی کی نیم وحشی، تہذیب وتمدن سے عاری زندگی گزار رہی تھی۔ پھر آبادکاری کی تہذیبی، تمدنی آسائشوں اور ترقیوں کا سلسلہ دائیں بائیں کی خانہ بدوش غیر مہذب اقوام تک آہستہ آہستہ منتقل ہونا شروع ہوا تو تہذیب وتمدن کے ان ہی طور طریقوں اور اسباب ووسائل جو میسوپوٹیمیا میں دریافت اور ایجاد ہوئے، کی بنا پر دیگر سلطنتیں اور حکومتیں قائم ہوگئیں۔ مشرق میں کسریٰ کی سلطنت اور مغرب میں رومی سلطنت۔

کسریٰ کی سلطنت کی بنیاد خورس یا کیخورس (Cyrus) نے رکھی۔ وہ 550 ق م کے لگ بھگ موجودہ ایران کے ایک حصے میں واقع غالباً میڈیا کے علاقے کا حکمران بنا۔ پھر اس نے اپنے قریب فارس کے علاقے کو فتح کرلیا اور دونوں علاقوں کو ملا کر اپنے زیر اثر کرلیا۔ پھر اس نے مغرب میں ایک سلطنت اشوری سلطنت کو 539 ق م میں تباہ کر کے میسوپوٹیمیا کے تمام زرخیز علاقے فتح کرلیے۔ اس کے بعد خورس نے حقیقی معنوں میں سلطنت کا نظام جو پہلے میسوپوٹیمیا میں ایجاد واختراع ہوا تھا، اپنی سلطنت میں جاری کیا۔

ایرانی یا کسریٰ کی سلطنت کے علاقے کا نقشے سے جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ، اگر اُس علاقے کے لوگوں کو اپنے مغرب میں میسوپوٹیمیا کے آباد علاقے میں مروج زراعت کاری کا علم ہوتا بھی تو، زراعت کے لیے استعمال نہیں ہوسکتا تھا۔ زمین انتہائی ناکارہ ہے، لہٰذا وہ لوگ زراعت پر انحصار نہیں کرسکتے تھے۔ وہ لوگ گلہ بان تھے، مویشیوں کو پالنا پوسنا اور خانہ

بدوش زندگی ان کی طرزِ حیات تھی۔

کسریٰ کی سلطنت کے قیام کے بعد عراق کے زرخیز علاقے فارسیوں کے قبضے میں آئے تو وہ زراعت کی طرف مائل ہوئے۔ انہوں نے زراعت کو آب پاشی کے نئے منصوبوں سے متعارف کرایا۔ اپنے زیر تسلط علاقوں میں سے مصر میں Seasame کی اور عراق کے علاقے میں چاولوں کی نئی فصل متعارف کرائی۔ جیسے میسوپوٹیمیا میں اشیاء کے تبادلے (خرید و فروخت) کے لیے کرنسی ایجاد کی گئی ایسے ہی خورس کے جانشینوں میں دارا (Darius) نے سونے اور چاندی کے سکوں پر مبنی کرنسی اور نتیجتاً معیشت متعارف کرادی۔

عام مالی خوشحالی سے سلطنت کے لیے مزید ٹیکسوں کا بھی دروازہ کھلا۔ ٹیکسوں کی ابتدا اور بڑھوتری سے سلطنت کے مالک ''بادشاہ'' کے پاس ڈھیروں خزانے جمع ہوگئے، بادشاہت کا کروفر اور نمود ونمائش نمودار ہوگیا۔

فارسیوں نے ایک شاندار دارالحکومت، صحرا کے درمیان میں، پرسی پولس (Persepolis) کے مقام پر بنایا۔ اس میں شاندار حکومتی عمارات تعمیر کیں۔ سونے اور چاندی سے بین الاقوامی تجارت بڑھی اور تجارت کی غیر ملکی اشیاء مثلاً کپڑا، قالین، اوزار، دھاتیں اور دیگر اشیاء کی ریل پیل ہوئی۔ سلطنت کی دولت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب 330 ق م میں سکندر نے ایرانی سلطنت کو شکست دی تو بادشاہ کے پاس، جیسا کہ تاریخ میں بیان کیا جاتا ہے، 5500 ٹن چاندی موجود تھی۔ چنانچہ عراق میں سلطنت، بادشاہت اور جاگیرداری کے نمودار ہونے کے بعد 500 ق م کے قریب عراق کے مشرق میں، عراق کی نقل میں ایران میں سلطنت (کسریٰ)، جاگیرداری اور بادشاہت نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مغرب میں ایک اور سلطنت کی بنیادیں پڑنا شروع ہوئیں، یعنی رومی سلطنت۔ رومی سلطنت کو اٹلی کی شہری ریاست Rome سے بنیاد پڑی۔ روم کی شہری ریاست نے اردگرد کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں کو مغلوب کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ آہستہ آہستہ اٹلی اور ساحلی شہروں پر ایک سلطنت قائم ہوئی جس نے توسیع اور الحاق کا سلسلہ شروع کیا اور تقریباً مزید چار سو صدیوں کی جدوجہد سے اپنی علاقائی وسعتوں کی چوٹی پر پہنچی۔ یعنی پورا مغربی، شمالی مشرقی یورپ، کوچک ایشیا، شمالی افریقہ اور بحیرۂ متوسط کے ساحلی علاقوں پر اس کا تسلط تھا۔ روم اور چند دیگر علاقوں کے علاوہ یورپ کی معاش ومعاشرت بھی گلہ بانی پر تھی۔ اٹلی اور چند دیگر محدود علاقوں کے علاوہ زراعت کے قابل زمین دستیاب نہیں تھی۔

سلطنت کے قیام کے بعد بادشاہت' حکومت کے تسلسل کے لیے معیشت کی تشکیلِ نو ہوئی۔ اب اس معیشت کی بنیاد زراعت اور غلاموں پر مبنی ہوگئی۔ اس سلطنت کا بڑا مسئلہ اتنی بڑی سلطنت کے شہریوں کی خوراک رسانی کا کام تھا۔ زراعت اور تجارت رومی سلطنت کے معاشی معاملات کی بنیاد تھے۔ لہٰذا اناج مہیا کرنے والے صوبوں کا حصول اور ان کا تحفظ' دیگر بہت سے عوامل میں سے ایک تھا جو سلطنت کی توسیع کا محرک اور ریاستوں کی فتوحات کا سبب بنا۔ ان فتوحات میں سے سب سے اہم صوبے مصر' سسلی' اور شمالی افریقہ میں تونیسیہ (Tunisia) تھے۔

مصر کا رومی صوبہ 30 ق م میں قائم ہوگیا' جبکہ افریقہ کا رومی صوبہ 146 ق م میں قائم ہو گیا تھا۔ یہ علاقے اناج (گندم وغیرہ) کی پیداوار اور بحری راستے سے فراہمی (shipment) کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل تھے۔ یہاں سے اناج براہِ راست Ostien' روم کی سرکاری بندرگاہ پر بھیجا جاتا' جہاں سے پوری سلطنت میں دوبارہ تقسیم کیا جاتا۔

سلطنت کے انتظام کے ماتحت (دیگر مغلوب علاقوں کی قیمت پر.....!) سلطنت کی خوشحالی کی بدولت اور بہت بڑی آبادی کی وجہ سے آسائش اور بیرونی درآمدات کی ضرورت شروع ہوگئی۔ چائنہ سے ریشم' مشرق بعید سے کاٹن' انڈیا سے مرچ' افریقہ سے ہاتھی دانت وغیرہ آنے لگے۔ پوری دنیا کے غلاموں کو بھی معلوم ہوا کہ ''تمام راستے روم کو'' جاتے تھے۔

بہرحال مختصراً یہ کہ عراق میں سلطنت کے قیام کے بعد' جو زمین کی ملکیت (ماجوج) اور زمین سے محرومی (یاجوج) کے طبقات پر منتج ہوئی اور جاری رہی' یہی امر (phenomenon) مشرق میں کسریٰ کی سلطنت کے قیام میں ظہور پذیر ہوا۔ کسریٰ کی سلطنت کی جاگیر (فصل پیدا کرنے والی جاگیر) یہی قدیم ''ماجوج کا علاقہ Mesopotamia'' تھا۔ لیکن اب ''ماجوج'' کسریٰ کی سلطنت تھی اور کل کے ماجوج اور اب یاجوج بن گئے (مفتوح ہوگئے)۔

ادھر دوسری سلطنت' مغرب میں رومی سلطنت بن گئی اور اس نے افریقہ کے Matgogs (زمین کے مالکوں) کو مغلوب کر لیا۔ یوں دو عظیم سلطنتیں نمودار ہوگئیں: کسریٰ اور روم' جو ماجوج کے مظہر (phenomenon) کی علامت تھیں۔ رومی سلطنت اپنے عروج کو پہنچ کر یعنی چوتھی صدی عیسوی میں' جیسا ماضی میں Mesopotamia کی سلطنتوں کے ساتھ ہوا' روبہ زوال ہوگئی۔ سب سے پہلا دھچکا سلطنت کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا تھا۔ مغربی حصے کا نام سلطنت روم رہا اور مشرقی حصے کا نام' جو ایشیائے کوچک اور مشرقی شمالی یورپ کے علاقوں پر مشتمل تھی' Byzantine یا بازنطین پڑ گیا۔ اس مشرقی سلطنت کا دارالحکومت بادشاہ قسطنطین

(Constantine) کے نام پر ترکی کا شہر قسطنطنیہ (Constantinople) بنا اور مغربی سلطنت کا دارالحکومت اٹلی کا شہر روم رہا۔

قسطنطین کے عہد میں عیسائیت کو رومی سلطنت کا سرکاری مذہب بنا دیا گیا۔ پہلے بادشاہ اور پھر پوری سلطنت نے عیسائیت قبول کر لی۔ مذہب عیسائیت کو قبول کرنے سے سب سے بڑا فائدہ سلطنت کے منظّم ہو جانے کی صورت میں ملا۔ قسطنطین نے دراصل ایک طرح سے روم کو 312ء میں دوسری بار صلیب کے جھنڈے تلے فتح کیا تھا۔

مشرقی رومی سلطنت یا بازنطینی سلطنت ایک ہزار سال کی مدت تک قائم رہی' تا آنکہ 1453ء میں قسطنطنیہ (Constantinople) ترکوں کے ہاتھوں فتح ہوگیا۔ رومی سلطنت کے قیام اور توسیع کے مراحل اور عوامل مختصراً یوں ہیں:

☆ شہری ریاست Rome کا قیام' تین سو قبل مسیح۔

☆ جنگ کے ذریعے شہری ریاست کا پھیلاؤ اور شہری ریاست سے بڑھ کر کئی صوبوں پر مشتمل عظیم رومی سلطنت۔

☆ سلطنت کا قیام تب عمل میں آیا جب قدیم گلّہ بانی' خانہ بدوشی سے منتقل ہو کر میسوپوٹیمیا اور کسریٰ کی سلطنتوں کی طرح زراعتی آبادکاری شروع کر دی۔

☆ زراعت اور کرنسی پر مبنی معیشت کا اجراء۔ قدیم بابل و نینوا کی طرح۔

☆ زیادہ اناج حاصل کرنے کے لیے زرخیز علاقوں پر قبضہ' مثلاً شمالی افریقہ' مصر یا ان کے لیے جنگ' مثلاً ایشیائے کوچک میں عراق اور اردگرد کے علاقوں کے لیے۔

☆ زمین کا ایک قلیل گروہ کے ہاتھوں میں ارتکاز' یعنی Mat gogs/جاگیردار کا ظہور اور بہت سے لوگوں کا محروم ہو جانا' یعنی کاشت کار/ہاری' gogs کا ظہور۔

دوسری طرف مغربی رومی سلطنت ایک لمبے عرصے کی اندرونی سیاسی کشمکش کے بعد ٹوٹ گئی اور بہت سے ممالک بن گئے۔

476ء میں روم پر شمالی یورپ کے جرمانی (Germanic) لوگوں کا حملہ ہوا اور سلطنت کا سقوط ہوگیا۔ ان جرمانی لوگوں نے سلطنت کے طول و عرض میں سکونت اختیار کر لی۔ ان جرمانی لوگوں میں فرانکس (Franks) سب سے بازی لے گئے اور حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ چارلس مارٹل (Charles Martle) جس نے 732ء میں ٹورس (Torus) کی جنگ میں سپین سے آئے مسلمانوں کو شکست دی' کا بیٹا شارلیمان (Charlamagn) فرانس

کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یوں فرانس (France) ایک ملک کے طور پر ابھر گیا۔

فرانس کے شاہ شارلیمان (Charlamagn) کو اپنی کامیابیوں اور عیسائیت میں پاپائیت کی حمایت کی وجہ سے پوپ لیوسوم (Leo III) نے 800ء میں تمام روم کا بادشاہ بنالیا' یعنی حملہ آوروں میں سے ہی فرانکس (Franks) نے دوبارہ ایک ملک اور پھر 800ء میں مقدس رومی سلطنت (Holy Roman Empire) کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔

اس سلطنت کے بھی حصے ہو گئے۔ 887ء میں سلطنت کا مشرقی حصہ جرمنی بن گیا جبکہ مغربی حصہ فرانس ہی رہا' یعنی ایک دوسرا ملک جرمنی ابھر گیا۔

فرانس کیتھولک (Catholic) عیسائیت کا مرکز بن گیا۔ عیسائیت کی وجہ سے فرانس کا اثر اپنے ملک سے باہر کے نئے ابھرنے والے ملکوں یا چھوٹے چھوٹے علاقوں پر بہت تھا' لیکن آہستہ آہستہ مقامی ریاستوں کے عیسائی فرانس کے نیم دلے وفادار جاگیردار' طاقتور ہوتے گئے۔ عیسائیت کے قائد ہونے کی وجہ سے وہ فرانس کے بادشاہ کو بادشاہ تو تسلیم کرتے لیکن معاملات میں اپنی من مانی کرتے تھے۔ یہی علاقائی جاگیردار آہستہ آہستہ ملکوں کے حکمران بن گئے۔

قدیم فرانسیسی رومی سلطنت پہلی سلطنت تھی جو یورپ میں قائم ہوئی۔ بادشاہ کے پاس صرف دس ہزار افسران ہوتے' جو اتنی بڑی سلطنت کے لیے بہت تھوڑے تھے۔ رسل و رسائل بہت سست تھے۔ سڑکوں کی کمی کی وجہ سے' دریا یا سمندر کی کشتی میں بری سفر سے زیادہ تیزی سے سفر ہو جاتا تھا۔ ریاست کے ستون' پادری' اشرافیہ اور عوام الناس کبھی کبھی ملتے' لیکن عملاً کوئی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ دولت میں کلیسا (Church) پہلے نمبر پر تھا۔ درحقیقت ساری ملکی دولت کا چالیس فیصد چرچ کے قبضے میں ہوتا' جو طویل المدت ہبہ (endowments) میں جڑا ہوتا۔ اس کی میعاد میں اضافہ تو ہوسکتا تھا لیکن کمی نہیں۔ بادشاہ (پوپ کو تو نہیں لیکن) بشپ وغیرہ کو نامزد کرتا۔ لیکن اس کے لیے اشرافیہ (nobility) سے بات چیت کرنی پڑتی جن کا مقامی خانقاہوں اور کلیسا کی ہیئت حاکمہ (establishment) سے رابطہ ہوتا۔ اشرافیہ (nobility) دولت میں دوسرے نمبر پر تھی' لیکن ان کا کوئی باہمی اتحاد نہ تھا' ہر نوبل کی اپنی زمین تھی۔

فرانس کے ماتحت علاقوں میں سے ایک علاقہ انگلینڈ تھا۔ اس کو مقامی ہیرو ولیم فاتح (William the Conqurer) نے فتح کر کے اپنی (انگلینڈ کی) حکومت بنالی۔ فرانس کے بادشاہ نے 1023ء میں انگلینڈ کے بادشاہ سے ملاقات کر کے ایک دوسرے کے علاقے پر دعوے کو ختم کر دیا۔ بعد میں فرانس کی اندرونی جنگ کے ساتھ ساتھ فرانس اور انگلینڈ اپنے اپنے

حمایتی امیدوار کو مقدس سلطنت روما (Holy Roman Empire) کا سربراہ مقرر کرانے کے لیے ایک دوسرے سے سیاسی مسابقت کرنے لگے۔ مثلاً فرانس کا فلپ دوم (Philip II) Swabiq کے فلپ کی حمایت کر رہا تھا اور انگلینڈ کا رچرڈ شیر دل (Richard, Lion hearted) اوٹو چہارم (Otto IV) کی حمایت کر رہا تھا۔ بالآخر Otto ہی مقدس سلطنت کا بادشاہ بن گیا۔

عظیم رومی سلطنت کی شکل میں قبل مسیح ایک سلطنت کے ظہور اور پھیلاؤ کے بعد تقریباً ویسے ہی عوامل اور مراحل' جو کبھی اس سلطنت کے ماضی اور تاریخ میں کارفرما تھے' کی طرح کے عوامل اور مراحل سے اسی جغرافیائی خطے میں چھوٹی مگر زیادہ مضبوط مملکتوں کا ظہور ہوا۔ ان کے نمایاں خدوخال یہ تھے:

☆ رومی سلطنت کے اندر جاگیروں پر قبضے اور جنگی فتوحات کے لیے باہم تصادم اور ملکوں کا قیام' مثلاً سب سے پہلے فرانس' پھر جرمنی' پھر انگلینڈ اور دیگر ممالک۔ یہ عمل تقریباً بارہویں صدی کے اختتام کے قریب مکمل ہوگیا۔

☆ جاگیروں کی ملکیت اور سیاسی و مذہبی قیادت کی صلاحیت کی بنیاد پر بہت سی مملکتوں کا قیام اور استحکام۔ یعنی ایک واحد مالک' مقدس رومی بادشاہ کے بجائے بہت سے مالکان' دوسرے لفظوں میں Matgogs۔ برطانیہ' جرمنی' فرانس کے بادشاہان اور ان کی عوام gogs (یاجوج) کاشت کار/ہاری۔

جیسے پانی بلندی سے پستی ہی کو بہتا ہے' بیج زمین میں ہی اگتا ہے پتھر میں نہیں' ایسے ہی عراق' مصر اور ان سے ملحق کسریٰ کی سلطنت اور رومی سلطنت' زمین کے جغرافیے کے وہ نمایاں مقامات ''جبل''، ''اوج'' یا ''ذروہ'' ہیں جہاں تاریخ انسانی کی آبادکاری کی زندگی کی ابتدا ہی میں ملکیت زمین Matgogs اور محرومیٔ زمین gogs کا شجر خبیثہ اُگا۔ یہ فتنہ و فساد کا وہ پھل تھا جس کو چکھنے سے نوع انسانی طویل العمر طبقاتی تقسیم میں بٹ گئی۔

(جاری ہے)

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

گلے میں ہو خراش، آئے ورم یا آواز بیٹھ جائے

شربت
توت سیاہ

سردی آتے اور جاتے وقت گلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے ایسے میں
گلے میں خراش، ورم آنے یا آواز بیٹھ جانے
کی شکایات عام ہوتی ہیں۔ ہمدرد شربت توت سیاہ کی چند خوراکیں گلے کی
ان شکایات کا فوری خاتمہ کرتی ہیں۔ اب سردی آئے یا جائے۔ آپ
کے گلے کو کیا گلہ۔ کیونکہ آپ کو تو ہے ہمدرد شربت توت سیاہ ملا۔

ہمدرد

FOCAL POINT

بولو کھُل کھُل کے!

مدرسین قرآن کے لیے خوشخبری

ترجمہ برائے تدریسِ قرآن حکیم

ازقلم

حافظ انجینئر نوید احمد حفظہ اللہ

مرکزی ناظم شعبہ تعلیم و تربیت
تنظیم اسلامی پاکستان

خصوصیات

★ تدریسی ضرورت کے پیش نظر طویل آیات کی مناسب حصوں میں تقسیم
★ ترجمے کا انداز بیانیہ ★ زبان و بیان: سلیس و عام فہم
★ ذیلی عنوانات کے ساتھ خلاصہ مضامین ★ ہر سورۃ سے پہلے اس کا تعارف اور مضامین کا تجزیہ
★ اضافی نکات برائے یادداشت کے لیے ہر صفحے پر مناسب جگہ

ناشر
شعبۂ مطبوعات
انجمن خدام القرآن
سندھ، کراچی، رجسٹرڈ

رابطہ: مرکزی دفتر
انجمن خدام القرآن سندھ کراچی
B-375 پہلی منزل، علامہ شبیر احمد عثمانی روڈ
بلاک 6 گلشن اقبال کراچی پاکستان
+92-21-34993436-7

الحمد للہ
پہلی جلد (سورہ فاتحہ تا سورہ مائدہ)
طبع ہو کر منظر عام پر آ گئی ہے

★ کاغذ سفید
★ صفحات 530 مجلد ★ رعایتی قیمت 500 روپے
publications@quranacademy.com

jan. 2015
Regd. CPL, No, 115
vol. 64
No: 1

Monthley Meesaq Lahore

سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دلپذیر موضوع پر
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فکر کا نچوڑ

سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

سیرت طیبہ پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

چند ہی ماہ کے دوران
دوسرا ایڈیشن چھپ کر آ گیا ہے!

- عمدہ طباعت
- صفحات: 240
- دیدہ زیب ٹائٹل
- قیمت: 180 روپے

خود مطالعہ کیجیے
دوستوں کو تحفتاً پیش کیجیے

ملنے کا پتہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور
قرآن اکیڈمی، 36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-35869501(042)
فیکس: (042)35834000 ای میل: maktaba@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

رسول اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصد بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرت نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

خود پڑھیں۔
دوسروں کو تحفہ میں دیجیں!

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042
maktaba@tanzeem.org